(مکتوبات کے آئینہ میں)

پی ڈی ایف اہتمام : غلام مصطفیٰ دائم

مرتب

اخلاق حسین عارف

ہمارے ماخذ

مرقع غالب ۔۔۔ مرتبہ جناب پرتھوی چند

ذکر غالب ۔۔۔ جناب مالک رام

یادگار غالب ۔۔۔ مؤلفہ شمس العلماء مولانا حالی

نادراتِ غالب ۔۔۔ مرتبہ آفاق حسین آفاق

خطوط غالب ۔۔۔ مرتبہ پنڈت مہیش پرشاد

عود ہندی، اردوئے معلّٰی و سبد چیں کلیاتِ فارسی و
تصانیف غالب

دیوانِ غالب اردو ۔۔۔

مکاتیب غالب ۔۔۔ مرتبہ علامہ امتیاز علی عرشی، ناظم علی رضا لائبریری رام پور

متفرقاتِ غالب ۔۔۔ مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب

آثارِ غالب ۔۔۔ مصنفہ شیخ محمد اکرام

خمخانۂ جاوید ۔۔۔ مصنفہ لالہ سری رام

غالب ۔۔۔ مصنفہ غلام رسول مہر

تذکرہ بہارِ سخن ۔۔۔ مرتبہ بابو شیام سندر لال برق سیتاپوری

جلوۂ خضر ۔۔۔ مرتبہ صفیر بلگرامی

آبِ حیات ۔۔۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد

"غالب کا تنقیدی شعور"

(مکتوبات کے آئینہ میں)

مرتب

اخلاق حسین عارف

مرتب ... اخلاق حسین عارف ۱۵۔ بارود خانہ لکھنؤ یوپی

پرنٹر ... سرفراز قومی پریس لکھنؤ

پبلشرز ... ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد لکھنؤ

تعداد ...

قیمت: تین روپیہ

سنہ اشاعت ...

ملنے کا پتہ

(۱) انوار بک ڈپو، [illegible] پارک لکھنؤ

(۲) دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

(۳) احباب پبلشرز اقبال منزل گولہ گنج لکھنؤ

غالب نواز

اردو پرست و ہردلعزیز ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی

گورنر اتر پردیش کی خدمت عالی

میں

جن کا سلجھا ہوا ذوقِ ادب ہندوستان بھر

میں مشہور ہے

اخلاق حسین عارف

شجرۂ نسب نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب

(جد اعلیٰ از سلجوقی خاندان شاہی) وارد سمرقند
شاہزادہ ترسم خاں

قوقان بیگ (وارد دلّی در عہد محمد شاہ)

عبداللہ بیگ (پدر غالب) — نصراللہ بیگ خاں بہادر، عارف جان کے داماد

نواب اسد اللہ خاں غالب — نواب مرزا یوسف بیگ خاں (لاولد)

سسرال — نانہال

عارف جان — خواجہ غلام حسین خاں کمیدان آگرہ

نواب احمد بخش خاں بہادر والی لوہارو — عزت النساء، والدہ اسد اللہ خاں غالب

نواب الٰہی بخش خاں معروف (خسر غالب)

امراؤ بیگم (اہلیہ اسد اللہ خاں غالب) — بنیادی بیگم (والدہ نواب زین العابدین خاں عارف)

علی بخش مرزا رنجور (لاولد)

نواب زین العابدین خاں عارف (پسر متبنیٰ حضرت غالب)

GOVERNOR

UTTAR PRADESH

GOVERNOR'S CAMP,
UTTAR PRADESH

راج بھون لکھنؤ

۱۴ر مارچ ۱۹۶۹ء

مکرمی تسلیم ۔ مجھے آپ کا خط ملا ۔ پڑھ کر خوشی
ہوئی کہ آپ نے مرزا غالب پر ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے جو ان کے
تنقیدی شعور کو جانچنے میں بڑی حد تک کارآمد ثابت ہوگی ۔ مرزا غالب
صرف غزل گوئی کے بادشاہ نہ تھے بلکہ ان کی نثر کی کاوش بھی قابل
تعریف ہے ۔ انھوں نے اسے جدید رجحانات دے کر سنوارا ۔ اُنھیں
نثری خزانوں میں مرزا غالب نے کہیں اپنے شاگردوں، کسی جگہ
اپنے دوستوں اور کسی مقام پر خود اپنے اشعار کے نکات بتائے ہیں ۔
انھیں خطوط میں سے انتخاب کر کے آپ نے ایک کتاب کی شکل
دے دی ہے ۔ یہ مسودہ میرے سامنے ہے ۔ یقیناً آپ نے
قابل تعریف کام کیا ہے ۔ جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔
آپ نے اس کتاب کو میرے نام منسوب کرنے کی جو تجویز رکھی
ہے تو میرے خیال میں یہ کتاب اگر کسی مشہور اُردو ادیب کے نام ہوتی تو
زیادہ بہتر تھا یا آپ کے کسی عزیز دوست کے نام ہوتی تب
بھی مناسب ہوتا ۔ مجھے اتر پردیش میں آئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہوا ۔
گو کہ مجھے اُردو زبان سے بڑی رغبت ہے پھر بھی آپ کی

تجویز کو مانتے ہوئے ہچکچاہٹ معلوم ہو رہی ہے۔ اب بھی آپ چاہیں تو کسی دیگر شخص کے نام منسوب کر سکتے ہیں۔ اگر آپ پھر بھی اصرار کرتے ہیں تو میں مجبوراً مرزا غالب کے احترام میں آپ کے انتساب کو منظور کرتا ہوں۔ ایک فوٹو بھی روانہ خدمت ہے۔

آپ کا مخلص

بی گوپالا ریڈی

جناب اخلاق حسین صاحب عارف۔ بارود خانہ لکھنؤ

"حرفِ آغاز"

یہ تو حقیقت ہے کہ اسد اللہ خاں غالب کو قدرت نے عجیب دل و دماغ ودیعت فرمایا تھا۔ ان میں اس نے وہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں جو عدیم النظیر تھیں۔ غالب کو اس کا پورا احساس تھا۔ مگر زمانہ کی بے حسی اور کم نگاہی پر ان کا دل ہمیشہ جلتا رہتا تھا۔ باوجود اس کے انکی خود اعتمادی میں کسی طرح کی کمی نہیں واقع ہونے پائی۔ انھوں نے اگر اپنی شاعری کے لئے ایک نئی راہ تلاش کی تو نثر نگاری کے لئے بھی جدید رجحانات کو اپنایا۔ نادر تشبیہات، خوبصورت استعارے تلاش کئے۔ تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی سے گلستانِ شاعری کو اس طرح آراستہ کیا کہ شاعری میں چار چاند لگ گئے۔ اسی طرح نثر کو چھوٹے چھوٹے بامعنی جملوں، تصنع سے پاک، شوخی، زندہ دلی اور ظرافت عزم واستقلال کا دامن تھامے آراستہ و پیراستہ کیا فطرت نے یہ عطیہ صرف انھیں کو عنایت کیا جو ان ہی پر ختم بھی ہوگیا۔ اگرچہ کہ شعراء نیز انشاپردازوں نے ان کی طرز نگارش کو اپنانا چاہا مگر منزل تو کجا اس رہبرِ کاردانِ شعروادب کی گرد راہ کو بھی نہ پہونچ سکے اور بالآخر ان کا یہ حشر ہوا کہ ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں۔

غالب نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو میں بھی۔ ان کے ہر دو دواوین اس کی زندۂ جاوید حقیقتیں ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فارسی میں بھی مکتوبات (پنج آہنگ، دُرفش کاویانی، دسبد چین) لکھے اور اردو میں (عود ہندی، اردوے معلّٰے اور رقعات غالب) بھی۔ اردو میں جو مکتوبات ہیں ان کی تعداد تقریباً ہزار تک پہونچتی ہے جن سے غالب کے نجی معاملات کے علاوہ، اس دور کے سماجی، معاشی، معاشرتی، اور سیاسی حالات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ نیز ان میں ایسے بھی بہت سے خطوط ہیں۔ جن میں انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفیقوں کے کلام پر اصلاح دی ہے۔ صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بہادر المتخلص بہ بیتاب کے نام غالب کے خطوط اس جہت سے اہم ہیں ساتھ ہی ساتھ مفید بھی، کہ ان کے ہمراہ غالب کے اصول اصلاح اور اصلاحوں کا معتد بہ حصہ اہل ادب کے مطالعہ میں آئے گا۔ کلام کا معتد بہ حصہ ایسا ہے جس کی تشریح انھوں نے اپنے مکتوبات میں کردی ہے۔ بہت سے اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے ان کے مطالب واقعہ کی تشریح کے ساتھ قلم بند کردیے ہیں۔ بہت سے اشعار انھوں نے اپنے مکتوبات میں ایسے استعمال کیے ہیں جن سے لطف اندوزی کے ہم دوش اس سے بھی واقفیت بہم پہونچتی ہے کہ وہ اشعار انھوں نے کب اور کس موقع پر کہے۔ بہت سے ایسے مکتوبات اس اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہیں کہ ان میں جابجا برمحل اشعار استعمال کیے ہیں نیز تاریخی پس منظر بھی دیدیا ہے۔

اور نیز انھیں خطوط میں سے ایسے مکتوبات تلاش کرکے یکجا کردیے ہیں جو

تقریباً ایک سو پندرہ ہیں۔ بہت مختصر اور تنگ وقت میں میری کاوش کس حد تک کامیاب ہوئی اس کا تجزیہ ملک کے وہ مایہ ناز اہل قلم کر سکتے ہیں جو غالب پر کافی تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ میری کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کے سلسلہ میں ان حضرات کا بزرگانہ و مشفقانہ مشورہ میرے لئے انتہائی بیش قیمت ہوگا۔

میں نے اس کام کے علاوہ نواب زین العابدین خاں عارف اور منشی نبی بخش حقیر کے بارے میں جہاں تذکرہ آیا ہے۔ وہاں مختصر تعارف کے بعد ان کا نمونۂ کلام بھی درج کر دیا ہے اس سے میرا مدعا یہ ہے کہ پرانے شعراء اور اساتذہ کے دواوین اور کلام رفتہ رفتہ فارسی اور اردو سے ناقدری اور چشم پوشی کی وجہ سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ان حضرات کے کلام کو بار بار دہرایا نہ گیا تو ایک دن اوروں کی طرح وہ بھی صفحۂ ادب سے مٹ جائیں گے۔

اس کاوش میں مرزا غالب کی ایک ایسی نادر تصویر شامل کی جا رہی ہے جس میں وہ اپنے کمرۂ مطالعہ میں بیٹھے فکر فرماتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تصویر نور چشم خورشید انور سلمہٗ نے دستیاب کی ہے۔ اور اسے فنی نوک پلک سے لکھنؤ کے جواں سال، مشہور و معروف آرٹسٹ جناب عرفان مرزا صاحب نے سنوارا ہے جس کے لئے میں ہر دو حضرات کا متشکر ہوں۔

اس سعی کی ترتیب و تدوین میں محترم و محتشم، مقبول حسین قصری کا صد درجہ ممنون ہوں جن کے مفید مشورہ، دل اور قدم قدم پر اشتراک و تعاون نے مجھے بڑا سہارا دیا۔

میں پروفیسر سید احتشام حسین صاحب، صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی،

الہ آباد کا حد درجہ متشکر ہوں کہ موصوف نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود کتاب ہذا کا تعارف قلم بند فرمایا۔

میں صوبۂ اتر پردیش کے غالب پرست گورنر ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی صاحب کا متشکر و ممنون ہوں کہ موصوف نے کتاب کا انتساب قبول فرمایا اور اپنی تصویر شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی نیز اپنا قیمتی پیغام بھی مرحمت فرمایا۔

سب کے بعد جناب انصار حسین صاحب منیجر سرفراز قومی پریس لکھنؤ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں جنھوں نے مسودہ کی تیاری میں اس درجہ تاخیر ہو جانے کے باوجود اپنی خصوصی نگرانی میں کتاب کو جلد از جلد زیور طبع سے مزین فرمایا۔ فقط

اخلاق حسین عارف

۱۵ - رفیع منزل - بارودخانہ - لکھنؤ (یو-پی)

المرقوم ۵ ر دسمبر ۱۹۶۶ء

"تعارف"

از:- پروفیسر سید احتشام حسین
صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

اب اس حقیقت کا اعتراف عام طور پر کیا جانے لگا ہے کہ ہر تخلیقی فنکار میں تنقیدی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی دادیٔ فن میں اس کی راہبر اور رہنما ہوتی ہے اور اسی کی مدد سے وہ اپنی تخلیق کو ان نقائص سے بچاتا ہے جو اظہار کے جوش میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اُردو شعرا میں اس کی سب سے اچھی مثال مرزا غالبؔ کی ذات ہے جن کا شعورِ فن ان کے سفرِ تخلیق کو آسان بناتا تھا۔ ہر اچھے شاعر نے کسی نہ کسی شکل میں اپنے نظریۂ شعر کی طرف اشارے کئے ہیں اور اپنے طریقِ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ کبھی یہ بات واضح رہتی ہے کبھی مبہم لیکن غالبؔ نے نہ صرف اپنی شاعری میں اس کے دھندلے نقوش پیش کئے ہیں بلکہ اپنے سیکڑوں فارسی اُردو خطوط اور متعدد نگارشات میں فنِ شعر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ لغت، قواعد، صنائع، محاورہ

اور روزمرہ کے علاوہ انھوں نے کبھی خود اپنے اشعار کی تشریح کر کے اور کبھی دوسروں کے کلام کی وضاحت یا کسی شاگرد کے کلام پر اصلاح دے کر اپنی تنقیدی نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ اگر ایسے تمام مقامات کو یکجا کر دیا جائے تو یہ کام نہ صرف علمی حیثیت سے مفید ہوگا بلکہ مرزا غالب کے سمجھنے میں بھی معین ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ اخلاق حسین صاحب، عارف نے بڑی دیدہ ریزی اور ہوشمندی سے یہ کام انجام دیا ہے اور غالب کی اکثر فارسی اُردو نگارشات کو کھنگال کر وہ چیزیں یکجا کر دی ہیں جن سے ان کی فنکاری کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

جس نے بھی غالب کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اس نے محسوس کیا ہوگا کہ انھوں نے کبھی اپنے طور پر اور کبھی کسی کے استفسار پر بعض ادبی نکات کی ایسی وضاحت کی ہے جس سے ان کی معنویت روشن ہو گئی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اُردو کے اہم شعرا میں مرزا غالب ہی کو سب سے مختلف قسم کے ادبی مسائل سے اُلجھنے کا موقع ملا، اسی وجہ سے ان کے خط ادبی بحثوں سے بھی بھرے ہوئے ہیں۔ کسی خط میں کسی شاگرد کو فن کے نکتے سمجھائے ہیں، کسی میں غلطی پر ٹوکا ہے، کسی میں اپنی انا کو تسکین دینے کے لئے اپنی فارسی دانی کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ کسی میں اپنے کلام کی داد چاہی ہے۔ کسی میں کسی فارسی شاعر یا لغت نویس کا مذاق اڑایا ہے۔ کسی میں جی کھول کر تعریف کی ہے۔ اس طرح یہ خطوط ان کی نجی زندگی اور تاریخی حقائق کے علاوہ ادبی معلومات کا بھی خزانہ بن گئے ہیں۔

اخلاق حسین صاحب عارف نے ان چیزوں کو یکجا کر کے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ بہ ظاہر یہ کام آسان ہے لیکن اوّل تو ہر کام جب انجام پا جاتا ہے آسان نظر آتا ہے دوسرے یہ کہ اس قسم کی یہ پہلی کوشش ہے اس لئے اس محنت کا اندازہ دشوار ہے جو مرتب کو کرنا پڑی ہے۔ اس لئے وہ ہماری نیک تمناؤں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دوسرے کام کرنے والوں کے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ خطوط کے اقتباسات اور اشعار کی تشریح کو محض ادبی لطائف سمجھ کر پڑھنا غالب کی معنی آفرینی پر ظلم ہوگا۔ انھیں دیکھ کر ان کی مدد سے غالب کے نظریۂ شاعری اور تصورِ فن کا تجزیہ کرنا غالب شناسی کے راز کھولے گا۔ یہی اس مواد کی افادیت ہے جو اس تالیف میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مرتب کی یہ کوشش پسند کی جائے گی۔

سید احتشام حسین

فن تحقیق و تنقید کے لئے بڑی ریاضت اور کاوش درکار ہے۔ اس کے لئے
بھی اعلیٰ فنون کی طرح خاص یکسوئی اور انہماک کی ضرورت ہے۔ معمولی کوشش
سے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی، نہ ہی آسانی سے ہر کس و ناکس منصب کی خلعت
اپنے جسم پر موزوں کرسکتا ہے۔ تنقید نگار کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی
شاعر یا فنکار پر تحقیق یا تنقید کرنے کے سلسلہ میں پہلے اس کی تخلیقات کا پوری
طرح تجزیہ کرے۔ جس میں فن کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور پنہاں رہتا ہے نیز ادب اور
زندگی کے جمال کا بھی کوئی نظریہ یا نقطہ نظر جلوہ گر رہتا ہے اگر وہ اس سے چشم پوشی
کرتا ہے تو تحقیق یا تنقید بے رخ اور بے بنیاد ہو کر رہ جائے گی۔ اسی نقطہ ہائے
نظر کو پیش نظر رکھ کر غالب پر مندرجہ ذیل مضمون قلم بند کیا جا رہا ہے ــ گو کہ
غالب پر کافی، تحقیقی کام ہوا ہے اور اس سلسلہ کا بہت ادبی ذخیرہ موجود ہے
مگر جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے عنوان کتاب کے تحت اس قسم کا مواد ہنوز
مجتمع نہیں کیا جا سکا ہے۔

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اکبر آبادی مولداً، و دلی مسکن، المخاطب بہ نجم الدولہ

دبیر الملک نظام جنگ، وہ خوش مذاق فنکار گزرا ہے جس نے ہندوستان کی اردو، فارسی شاعری اور نثر کو خلعت تجدید عطا کیا۔ اس کا شمار ہندوستانی ادب العالیہ کے چند اہم اور قابل قدر تخلیق کاروں میں ہے۔ اس کی شاعری نے نئی طرح ڈالی جس میں عجمی روایات کی قلم لگی ہے۔ وہ اپنی شکل پسندی اور پے چیدہ گوئی کے باوجود سادگی و پرکاری اور بے خودی و ہوشیاری کی بناء پر عالمی ادب کو اظہار اسلوب کے بیش قیمت اور لائق تقلید نمونے دیتی ہے وہ صرف شاعری و نثر نگاری ہی میں نہیں بلکہ وضع قطع، لباس و طعام طرز ماند و بود۔ یہاں تک کہ جینے اور مرنے میں بھی طریقہ عام پر گامزن ہونا پسند نہ کرتا تھا

غالب کی نثر نیز اشعار میں بھی قدیم و جدید شعرا کے متعلق کچھ صریح، کچھ مبہم آرا ملتی ہیں۔ ان شعرا میں اردو کے شاعر بھی ہیں۔ اور فارسی کے بھی ساتھ ہی نثر نگاروں اور ادبی تحریکوں اور دبستانوں کا تذکرہ بھی ہے۔ ان تمام چیزوں کی آگہی کے لئے مکتوبات کے آئینہ میں اچھا خاصا مواد ملتا ہے۔ جس سے بڑے کار آمد اور اہم نتائج نکلنے کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

یوں تو انھوں نے عرفی، ظہوری، بیدل، خسرو، میر، ذوق، ناسخ وغیرہم کی برتری اور عظمت کا اعتراف جابجا کیا ہے مگر میری دانست میں غالب ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے غزل کو نئے مضامین سے بھر دیا اور فلسفہ و حکمت کا رنگ دے کر گہرائی اور گیرائی بخشی ورنہ غالب کے عہد تک غزل گوئی برابر ایک ہی ڈھرے پر گامزن تھی۔ وہ شعر و سخن کے میدان میں ایک نئے آہنگ کیساتھ

داخل ہوا۔ غزل کو نیا لب ولہجہ اور نئے انداز بیان سے آراستہ و مرصع کیا۔
شاعری میں بے شمار عنوانات ہیں۔ طنز، ظرافت کو دیکھئے تو زعفران زار، گہرائی افکار
کا مشاہدہ کیجئے تو بے مثال، طرز ادا اور ندرت پر توجہ کیجئے تو اک جہانِ نو کی سیر
سے لطف اندوز ہوئیے اس کی شاعرانہ عظمت میں گنجائش کلام نہیں۔ اپنی تصنیف
درفش کاویانی میں وہ اپنے اعلیٰ مقام کے بارے میں خود رقم طراز ہے۔ جو آج ہمارے
لئے پیشین گوئی کا مرتبہ رکھتی ہے اور ہم بلا تامل اسے ولی کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"روح سخن کی جستجو میں میری عمر کے باون برس گزر چکے اور اب میری عمر
چھپا سٹھ کی ہو چکی ہے۔ میں اس نعمت کلام عطا کرنے والے
خداوند کریم کا شکر گزار ہوں کہ کمالات فن سے نوازنے والے
مالک نے ان باون برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور
معنویت کے دروازے کھول دیئے ہیں اور میرے فکر و خیال کی
کرسی کو معرفت و آگاہی کی کس بلندی پر جگہ دی ہے۔ وہ بیان
نہیں کر سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے دور کے لوگوں نے میری
شاعرانہ خوبیوں کو نہیں پہچانا۔ ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہ نظری
سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظر کو روشنی بخشنے والے کمالات کہ جن کو
میں نے اپنی نظم و نثر میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھ کر یہ
لوگ پیچ و تاب میں پڑ گئے"

اسی سلسلہ میں شاکر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔
"نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت دا عانت

سے خوب ہو چکا ہے اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و
نشان باقی و قائم رہے گا"

غالب کی شاعرانہ عظمت میں تو گنجائش کلام نہیں مگر ان کی نثر نگاری کا مرتبہ بھی ان کی شاعری سے کم بلند نہیں۔ ایسے لوگ کم پائے گئے جن میں گوناگوں کمالات یکجا پائے جائیں، اگر کسی میں ملکۂ شاعری بام عروج پر نظر آیا تو کسی کو نثر میں موتی بکھیرنے کی قدرت عطا ہوئی، کسی کا قلم جاندار رہا تو کسی کی زبان تیغ جوہردار۔ مگر ہمیں غالب ہی ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جہاں صلاحیتیں برابر کی حیثیت سے جلوہ فگن ہیں۔ اگر وہ ایک طرف عظیم شاعر ہیں تو دوسری طرف اعلیٰ پایہ کے انشا پرداز بھی ہیں۔

غالب کی نثری تصانیف میں مکتوبات کا سرمایہ گراں بہا ہے وہ اگر ان کی داخلی اور خارجی زندگی کے ترجمان ہیں تو دوسری طرف ان کی شوخیٔ تحریر اور نفاست بیان کی جیتی جاگتی تصاویر ہیں۔ غالب کے کلام کا معتدبہ حصہ ایسا ہے جس کی تشریح انھوں نے اپنے مکتوبات میں کر دی ہے۔ بہت سے اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے ان کا مطلب واقعہ کی تشریح کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ بہت سے اشعار انھوں نے اپنے مکتوبات میں ایسے استعمال کیے ہیں جن سے اشعار سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ اس سے بھی واقفیت ہو سکتی ہے کہ وہ اشعار انھوں نے کب اور کس موقع پر کہے۔ بہت سے ایسے مکتوبات اس اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہیں کہ ان میں جا بجا برمحل اشعار کا استعمال کیا گیا ہے نیز تاریخی پس منظر بھی ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

نقش فریادی ہے کس شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر کو بعض شارحین نے بے معنی اور مہمل قرار دیا ہے جو سراسر انصاف کے منافی ہے کیونکہ شعر مذکور کی تشریح خود غالب نے عبدالرزاق شاکر سے اپنے مکتوب میں کردی ہے۔ لکھا ہے کہ :-

"ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے روبرو جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کسی کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبارِ محض ہو، موجب رنج و ملال ہے"[1]

کاوِ کاوِ سخت جانی، ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

شیریں کے عاشق فرہاد نے کوہِ بے ستون کو عرصۂ دراز کی محنت شاقہ سے کاٹ کر جوئے شیر نکالا تھا۔ روایت ہے کہ شیریں کا ہمراز شاپور اپنے دوست فرہاد کو شیریں کے پاس لایا۔ فرہاد شیریں کو دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا۔ جب اس کے عشق کا چرچا پھیلا تو خسرو کو پتہ چل گیا اس نے بطور سزا کے فرہاد سے کہا کہ شیریں کو تازہ دودھ فراہم ہونے میں دقت ہے اگر تو کوہِ بے ستون کو قطع کر کے اس کے

---

[1] قدیم عرب میں بھی یہ دستور تھا کہ خون آلودہ پیراہن بانس پر لٹکا کر داد خواہی کا اعلان کیا جاتا تھا۔ عہدِ نبوی کے بعد تک اس رسم کا سراغ ملتا ہے (عارف)

لئے نہر شیر محل کے نیچے سے لے آئے تو شیریں کو پا سکتا ہے۔ خسرو کو یقین کامل تھا کہ چونکہ یہ عمل جان لیوا اور ناممکنات میں سے ہے فرہاد سے نہ ہو سکے گا اس طرح ایفائے عہد کا موقع تا زیست میسر نہ ہو گا مگر عاشق صادق ایسی لگن و تن دہی سے اس کے تکملہ میں لگا کہ سالہا سال کی محنت شاقہ سے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ جب وعدہ وفا کرنے کا موقع آیا تو خسرو نے ایک مکار بڑھیا کے ذریعہ جھوٹی خبر اڑا دی کہ شیریں جاں بحق تسلیم ہو گئی یہ سنتے ہی فرہاد نے تیشہ سے اپنا سر پھوڑ کر جان دیدی۔ اس تمہید سے شعر کا تاریخی پس منظر دینا مراد تھی ورنہ شرح یہ ہے کہ ہجر کی شب کاٹنی اتنی مشکل ہے جتنی فرہاد کو دودھ کی نہر لانے میں لاحق ہوئی تھی سے

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ — مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

جراحت۔ زخم الماس۔ ہیرا جس کے چاٹنے سے آدمی مجروح ہو جاتا ہے اور جس کا سفوف زخم پر چھڑکنے سے سخت کرب واذیت ہوتی ہے۔ ارمغان تحفہ مبارک ہو کہ تمہاری دردمند جان کا ہمدرد عشق اس شان کے ساتھ تم سے ملنے آیا کہ جگر کے داغ اور الماس جیسے تحفے ہمراہ لایا ہے سے

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اس شعر کا مطلب غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کو ایک خط میں اس طرح لکھا ہے:۔

"رقیب۔ بمعنی مخالف۔ شوق۔ سروساماں کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس زندگی میں ننگا بوا پھرتا تھا تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر

باتو عریاں ہی کھنچی ہے جہاں کھنچتی ہے!!

اسی غزل کے ایک دوسرے شعر

زخم نے داد نہ دی تنگئ دل کی یارب

تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

کی بھی تشریح غالب نے شاکر سے اس طرح کی ہے: یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ظاہر۔ نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکاں۔ وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیئے یعنی زخم تیر تو بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے زخم نے داد نہ دی تنگئ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگئ دل کو پرافشاں بہ معنی بے تاب اور یہ نقطہ تیر کے مناسب حال ہے معنی یہ کہ تیر تنگئ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا"۔

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

بعض شارحین کا خیال ہے کہ پتہ نہیں غالب نے کب یہ غزل کہی جس کا مقطع اوپر درج ہے مگر مکتوب کے آئینہ میں یہ حقیقت اجاگر ہو جاتی ہے۔ غالب میکش غلام نجف خاں کو ایک خط میں رقم طراز ہیں:۔

"خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے، تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمہیں تہنیت دی تو مناسب، للہ الحمد، للہ الشکر۔ بھائی سچ تو یوں ہے کہ ان دنوں میرے پاس ٹکٹ ہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ۔ اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا نقصو

تمھارے والد ماجد اور تمھاری والدہ ماجدہ اور تمھارے عم عالی قدر سے کہہ چکا ہوں خلاصہ یہ کہ میری بیوی بچوں کو کہ تمھاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو۔ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بشرطا ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کر لیا۔ میرا مقصد سیاحت کلکتہ ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں سے دل اکھڑ گیا چل دیا؟ یہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاوینگے کیا

اس زمانہ میں کہی گئی ہے۔ جب غالب مصائب و تنگدستی کا شکار تھے اور دلی کو خیر باد کہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ مگر پھر اپنے خاندانی وقار کو مد نظر رکھتے ہوئے دلی چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا جیسا کہ غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں ــــ "بھائی میرا دکھ سنو اپنیا لے جانے میں ایک سُبکی اور ذلت تھی!!"

؎ ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب   حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

مندرجہ بالا شعر کے تاریخی پس منظر کی وضاحت غالب نے نواب کلب علی خاں سابق والی رامپور کو خط میں کی ہے جو قصہ داستان امیر حمزہ کے متعلق روشنی ڈالتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"حضرت ولی نعمت۔ آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے داستان امیر حمزہ قصۂ موضوعی ہے شاہ عباس ثانی کے عہد میں

ایران کے صاحب طبعوں نے اس کو تالیف کیا ہے۔ ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان اس کو کہتے ہیں اور ایران میں رموز حمزہ اس کا نام ہے دو سو کئی برس اس کی تالیف کو ہوئے اب تک مشہور ہے اور ہمیشہ رہے گا آپ کے اس تکیہ وار روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے مشتمل اس التزام پر کہ تشبیب کے ابیات اور مدح اشعار میں حمزہ اولاد حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ ان کے معاملات وحالات کا ذکر درمیان آئے سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں امید ہے حضرت اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں......۱ھ

درد منّت کش دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

اس غزل کے متعلق غالب حاتم علی مہر کو تحریر کرتے ہیں" میرا کلام میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا وہ انھوں نے لکھ لیا ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہو گئے اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ایک غزل کہیں سے لکھوا لایا اس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔"

اس خط کے ساتھ مندرجہ بالا شعر پر مشتمل غزل جس میں دس اشعار ہیں روانہ کی گئی۔ اسی غزل کا چھٹا شعر ملاحظہ ہو شہ

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

نمرود ایک بادشاہ گزرا ہے جس نے دعویٰ خدائی کیا تھا وہ اتنا ظالم و جابر تھا کہ جو کوئی اسے خدا تسلیم نہیں کرتا تھا اس پر وہ بے انتہا مظالم ڈھاتا تھا مطلب شعر کا یہ ہے کہ اس خدائے تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی نمرود کا عہد حکومت تو نہ تھی جس میں مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اس خدائی میں تو میری آرزوئیں اور تمنّائیں پوری ہونی چاہیئے تھیں۔ بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ بندہ ہوتا ہے۔ اسی غزل کا مقطع ؎

کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں　　آج غالب غزل سرا نہ ہوا

یہ غزل قلعۂ معلیٰ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی۔ مشاعرہ طرحی ہوا کرتا تھا۔ مگر چونکہ غالب نے طرح پر غزل نہیں کہی تھی اس لئے لوگوں کے اصرار پر دہیں غزل کہہ کر سنادی جس کا اظہار مقطع میں ہے۔

؎ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا۔ خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

خط بنام عبدالجلیل جنوں میں غزل گم ہو جانے کی بات کس شوخی سے پیدا کی ساتھ ہی ساتھ شعر مذکور کی تشریح بھی کردی لکھتے ہیں:۔

"جناب عالی! وہ غزل جو ہمراہ لایا تھا وہاں بھو کچی جہاں میں اب جانے والا ہوں۔ (یعنی عدم مدعا یہ ہے کہ گم ہوگئی) ؎

گھاتے ہیں مدعا برآری کی

ہم نے غیروں کی غم گساری کی

کے تعدیم و تاخیر مصرعین کرکے رہنے دو اس میں کوئی سقم نہیں۔ مدعا برآری

کا یتھوں کا لفظ ہے۔ میں اس طرح کے الفاظ سے پرہیز کرتا ہوں مگر چونکہ من حیثیت معنی یہ لفظ صحیح ہے مضائقہ نہیں۔

قطرہ مے ــــ الخ۔ اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے بقدر یکمژہ برہمزدن ثبات و قرار ہے حیرت از آدر حرکت کرتے ہی قطرہ مے افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا ہے، ابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بصورت اس تاگے کے بن گیا جس میں موتی پروئے ہوں۔ ــ

یک الف بیش نہیں، صیقل آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

ماسٹر پیارے لال آشوب کو ایک خط تحریر کرتے وقت غالب شعر کی شرح خود کرتے ہیں "پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت ہے فولاد کے آئینہ سے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھئے۔ مصرع "چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا" یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنوں ہے اب تک کمال فن حاصل نہیں ہوا، آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ بس ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں میں سے ہے۔"

اس میں کلام نہیں کہ غالب کے بعض اشعار میں اس قدر دقیق مضمون اور ایسے ایسے نکتے پنہاں ہیں کہ اگر وہ ان کی تشریح خود نہ کر دیتے تو بڑا الجھاؤ تو رہتا۔

ے۔ عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس سلسلہ میں لکھا ہے۔ "افسوس ہے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو جانو کہ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا کوئی دم ایسا نہیں کہ مجھے دم واپسین کا خیال نہ ہو۔ ساٹھ برس کا ہو چکا اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، قطعہ، رباعی، فارسی اردو دس ہزار بیت کہہ چکا ہوں اب کہاں تک کہوں گا زندگی بری بھلی جس طرح بنی کاٹی اب فکر یہ ہے کہ دیکھئے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا در پیش آتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔

ے عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ   مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا   کہتے ہیں ہم تم کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک خط میں مرزا حاتم علی مہر کو یوں تحریر فرماتے ہیں۔ میں نے کتابیں جا بجا بھیجیں یہ سبیل پارسل ارسال کی۔ اگرچہ پہونچنے کی خبر پائی ہے مگر نوید کہیں سے نہیں آئی۔ رات دن گردش میں ہیں . . . . الخ دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیسا ہے ے جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا۔ کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!! اس کے علاوہ ایک خط بنام مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" لکھا ہے جس سے مرزا کی دماغی صلاحیت، علمیت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں" کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ، نہ ہجوم امراض جسمانی آلام روحانی سے فراغ۔ آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی اور اپنا یہ شعر اردو میرے ورد زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ

سچ نغاں رہتا تھا:۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں | ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

نواب انورالدولہ سعیدالدین خاں شفق کو لکھتے ہیں: "اللہ اللہ دریا سارا تیر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔ . . . .

عمر بھر دیکھا کیے ۔

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ | لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

متاع سخن یعنی کلام کی دولت۔ مطلب واضح ہے یعنی ہم اپنے متاع سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن فہم اور سخن شناس ہو۔ اس سلسلہ میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے متعلق لکھتے ہیں۔ یہ خط کتنا حسرت آمیز ہے ملاحظہ ہو

"خدا نے میری بے بسی و تنہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جس نے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا اس نے اپنی باتوں سے ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو

کہتے ہیں. مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصہ کئے آدھا یوسف
کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن
اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی
بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصہ میں آیا ہو. گو زمانہ اور آسمان
میرا کتنا ہی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی بدولت زمانہ کی دشمنی
سے بے فکر اور اس نعمت دنیا پر قانع ہوں"... (یادگار غالب)

ے لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین   کرتا جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

غالب نے عبد الجلیل جنوں کو اس شعر کی تشریح یوں تحریر کی ہے:-
"لیتا نہ اگر دل..... الخ یہ بہت لطیف تقریر ہے. لیتا کو ربط ہے
چین سے، کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے. عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں
معیوب ہیں. فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور ملیح
ریختہ تقلید ہے فارسی کی حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم
چین لیتا اگر نہ مرتا کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا" یہ پوری غزل جس کا مطلع ہے ے
ہے بس کہ ہر اک انکے اشارے میں نشاں اور   کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
اس ایک شعر کو چھوڑ کر غالب نے غزل حاتم علی مہر کو ارسال کی تھی. علاوہ
ازیں اس غزل کے سات شعر اور ایک دوسری غزل، جس کا مصرع ہے ے

نجا اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے۔ نواب علائی کو اپنی یادداشت پڑھ بھیجی تھی ۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ غزل نہیں مرثیہ ہے غالب کے بھانجے نواب زین العابدین عارف کا جنھیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ غالب نے یہ مرثیہ ان کی موت پر لکھا جو عین عنفوان شباب میں راہی ملک عدم ہوئے۔

نواب زین العابدین خاں عارف، شرف الدولہ سہراب جنگ نواب غلام حسین خاں مسرور کے بیٹے تھے ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کے تعلقات اپنے شوہر سے اچھے نہ رہتے تھے اس لئے انھیں سات ہزار کی ملکیت کا مکان دے کر علحدہ کر دیا تھا چنانچہ عارف کو ان کی والدہ بنیادی بیگم نے پالا پوسا اور اس زمانہ کے ماحول کے مطابق اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دلائی انھیں سرکار انگلشیہ سے ڈھائی سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا اکیس سال کی عمر میں فخر الدولہ رستم جنگ نواب احمد بخش رئیس فیروز پور جھرکہ کی لڑکی نواب بیگم سے شادی ہوئی اور ڈھائی سو روپیہ ماہانہ اس ریاست سے ملنے لگا جو تا زیست ملتا رہا۔ نواب بیگم کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۸۳۹ء میں شادی کے دو سال بعد انتقال کیا۔ عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا احمد علی کی صاحبزادی بستی بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے دو لڑکے نواب باقر علی خاں کامل اور نواب حسین علی خاں شاداں تولد ہوئے۔ انتقال کے وقت عارف کی عمر ۳۶ سال تھی۔ غالب سرہانے موجود

تھے کہتے ہیں کہ دمِ رحلت عارف نے بہ نگاہ حسرت و یاس ان کی طرف دیکھکر
یہ شعر پڑھا اور قفسِ عنصری سے روح پرواز کر کے عالم بالا ہوئی ؎
آنکھوں میں دم ہے مثلِ چراغ سحر ہوں میں۔ تو لگ رہا ہے جان کو کیا انتظار ہے
ویسے تو مرزا غالب کے یہاں بھی ہر دو صنف کے سات بچے ہوئے
مگر ان میں سے کوئی بھی سوا سال سے زیادہ جانبر نہ ہوا۔ بنا بر ایں عارف
کو جو ان کی اہلیہ امراؤ بیگم کے بھانجے تھے متبنّیٰ بنا لیا تھا۔ عارف سلیم الطبع
اور خوش فکر ہونے کے باعث غالب کو بہت عزیز تھے۔ ان کی اچانک موت
کا مرزا کو بہت قلق ہوا جس کی بنا پر یہ دلدوز نوحہ لکھا۔ اتفاق یہ کہ اسی سال
مومن اور تسکین بھی عالم بقا کو سدھارے۔ چنانچہ مرزا قربان علی بیگ سالک
نے ذیل کی تاریخ کہی ؎

برس دلی میں مرے یہ تین شاعر	کہ جو تھے حضرت دلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت	رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب	ارم میں عارف و تسکین و مومن

۱۲۶۸ھ = ۴۰ + ۳۱۵ + ۲۲۱

فسانخ نے تاریخ لکھی ؎

مرد امروز میرزا عارف	دوستانش شدند با غم جفت
سال مرگش چو از خرد جستم	"خلد اعلا مقام عارف" گفت

۱۲۶۸ھ

عارف کا مختصر نمونہ کلام ہدیہ ناظرین ہے ؎

مانا یہ ناصحا کہ نہ اس سے ملا کریں بہتر تو ہاں یہی ہے مگر دل کو کیا کریں

تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں

خود ہیں خجل کہ جیتے رہا سکے ہجر میں
اپنا یہ منہ نہیں ہے کہ اس سے گلا کریں

ہے عاشقوں کو ننگ تمنائے سلطنت
کیوں آرزوئے سایۂ بالِ ہما کریں

خوبی ہے ضبطِ دل کی کہ آنکھوں میں نم نہیں
روؤں اگر تو خون کے دریا بہا کریں

رتبہ ہمارے جد کا فرشتوں سے پوچھئے
کیا اپنے خانداں کا بیاں سلسلہ کریں

. . . .

دیارِ عشق میں تیرا گزر ہووے تو میں جانوں
اگر سر تک بھی جا کر راہ سر ہووے تو میں جانوں

مرا گریہ بہا دیتا ہے ہر اک بات کو میری
بس ان باتوں سے اسکے دل میں گھر ہووے تو میں جانوں

گزر کر جان سے اپنے قدم رکھ راہِ وحشت میں
اگر پھر عمر بھر تجھ کو خطر ہووے تو میں جانوں

لبِ ساحل کرے منہ کو ر کوئی میری ناکامی
صدف میں قطرۂ نیساں گہر ہووے تو میں جانوں

. . . .

ہر چند کہ اب مجھ سے ستم اُٹھ نہیں سکتا
لیکن ترے کوچے سے قدم اُٹھ نہیں سکتا

جو کعبہ میں ہے وہی بتخانے میں جلوہ
اک پردہ ہے جو شیخ حرم اٹھ نہیں سکتا

عالم میں لٹاتے ہو بڑی حسن کی دولت
میری ہی طرف دستِ کرم اٹھ نہیں سکتا

کیا ضعف نے شرمندہ کیا صبر کے آگے — فرقت میں تری بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

باتیں ہزار پیچھے بناتے ہیں بیٹھ کر — معذور کیا کہ بول سکیں روبروئے دوست

گو زخمہائے تن مرے بھر آئے چارہ گر — اے بیخبر! جراحتِ پنہاں کا کیا علاج

ساغر اک ہاتھ میں، اک ہاتھ میں مینائے شراب — ہے یہ انداز ترا، ساقیٔ سرشار پسند

ہم بیکسوں کا آن کے تو ہی تو اب ہے — اے موت، رحم کر مرے حالِ تباہ پر

چپ پڑے رہتے تو کیوں پاس اٹھائے جاتے — ہائے کیوں شور مچایا تری دیوار کے پاس

اک دیکھنا ہی کہئے تو اس کو بھی چھوڑ دیں — رکھتے نہیں ہیں آپ سے اس کے سوا غرض

پھر دشمنوں کی خاک شکایت کریں بھلا — جب دوست دیکھ سکتے نہیں آرزوئے دل

اٹھتا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں — پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

اے فلک خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو — دشت میں رہتے ہیں مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا

مت کہو وہ بات عارف! جو گراں خاطر پہ ہو — کیا مزہ ہے، گر جبینِ آشنا میں بل پڑا

صبحِ ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم — میں شبِ وصل کی ہرگز نہ تمنا کرتا

سخت ترلے میں اتنا نہ سمجھا تھا انھیں — چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا

دیکھ کے اک بار ہی اس کو وہ بیخود ہوئے — پھر نہ ہوا حشر تک، بارِ دگر دیکھنا

اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں — آپ جو کہتے ہیں، ہم رکھتے نہیں اپنا جواب

میں تو مر جاتا وہیں، غیرت سے کوہِ طور پر — اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے موسیٰ جواب

چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو اے نالۂ دل — بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپ سے آپ

لذتِ درد سے محفوظ وہ ناکام نہیں — جس کو بیتابیٔ دل باعثِ آرام نہیں

کچھ تو ہے بات، کہ خاموش رہا کرتا ہوں — کچھ تو ہے کام، کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں

زاہدا! مے کدہ کی راہ سے گزرا مت کر — رہن ہو جائے نہ یہ جبہ و دستار کہیں

عارف! بتا کہ سر ہے یہ کس دن کے واسطے — پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں کیے ہوئے

آج کیا تیغ بکف اس کو سنا ہے عارف — آپ اس وقت جو یوں جاتے ہیں گھبرائے ہوئے

لذتِ درد سے بے چارہ نہیں ہے واقف — لے گیا چھین کے غم خوار نمک داں مجھ سے

آغازِ دردِ عشق کے انجام کو نہ پوچھ! — یہ ابتدا ہے وہ، کہ نہ جس کی خبر ملے

گھر کے لٹنے ہی سے تم غم میں پڑے ہو عارف — دور کیا کیا وہ ابھی کرتے ہیں دیکھا کیجے

چین اک دم نہیں بیتابیٔ دل سے عارف — کس نے رکھ دی ہے مرے سینے کے اندر بجلی

رہتی غمِ فرقت میں کچھ بھی جو توانائی — شہرت مری افغاں کی تا عرش بریں ہوتی
امید ہے کب، عارف! نالہ کی رسائی کی — یہ بیل منڈھے چڑھتی، معلوم نہیں ہوتی

اب مختصر سا فارسی کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:-

نزاکتے ست ترا باعثِ درستی عہد — دگر ز شیوۂ خوباں شکست سوگند ست
ہزار سال کند مشق دیدنِ خورشید — بدیدنِ رُخِ تو، ہر کہ آرزومند ست
کسے ز دوست شکایت کند، خدا نکند — بلطفِ دشمن و عارف بجور خورسند ست

دمے بہ پرسشِ من گر زباں بجنباند — کلاہِ گوشۂ من آسماں بجنباند
ز ورد دل بدرت آنچناں فرد گویم — کہ موجِ آبِ سرشک آسماں بجنباند

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالبؔ نے ذیل کے خط میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو یوں تحریر فرمایا ہے:-

"کیوں ترکِ لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا؟ جس کو اُتار پھینکو گے، ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے۔ بغیر کھائے پیے گوارا نہ ہوگا۔ سختی اور سستی، رنج و آرام کو ہموار کرو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گذرنے دو ع تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ"

نیز نواب علائی کو بھی لکھا:-

"بھائیوں سے کچھ نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار، میرا سلام اخوین کو اور ان کا سلام پہونچا دیتا ہے۔ اسی کو غنیمت جانتا ہوں ع تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ۔"

ے مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اس شعر کے متعلق غالبؔ نے عبدالرزاق شاکر کو یوں لکھا ہے:-

"بندہ نواز زبان فارسی میں خطوط کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی جگرکاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے ے

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ پر تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ میں اب اٹھائے

عمر ناپائدار کو پہونچ گیا۔ آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیئے، نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت سے خوب ہو چکا ہے، اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا"

یہ پیشین گوئی حقیقت بن گئی، کیونکہ بیسویں صدی کے اول سے تا حال غالبؔ پر اتنا کام ہو چکا ہے، یہی اتنا کچھ قیامت تک ان کا نام و نشان باقی رکھنے کو کافی ہے، نہ کہ ابھی عصر حاضر کے لکھنے والوں کے بعد آنے والی نسلیں نہ جانے کتنے ادبی و تحقیقی کام غالب پر کریں، یہ احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا ۔

غالبؔ کی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔ ؎

مہربان ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت	میں گیا وقت نہیں ہوں، کہ پھر آبھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے	بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ	کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اس غزل سے متعلق مولانا امتیاز علی عرشیؔ ناظم اعلیٰ رضا لائبریری رامپور نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں !۔

"جناب حامد حسن قادری نے نہایت دلچسپ اطلاع بہم پہنچائی ہے، اپنے مکتوب بنام حیرتؔ شملوی رقم طراز ہیں۔ میرے پاس بزرگوں کے وقت کا دیوان غالب ہے اس میں میرے والد مرحوم کے قلم سے یہ دو شعر لکھے ہیں" ؎

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

ان اشعار کے ناقل مولوی صادق علی تاباں گروہ کیتہ نی غالب کے زمانہ کے ایک بزرگ تھے۔ اغلب ہے کہ غالب نے دیوان شایع ہوجانے کے بعد مندرجہ بالا شعر کہے ہوں۔ بہرکیف اشعار کا انداز، مرتبہ، بندش الفاظ، نیز طرز ادا سابقہ اشعار کے ہم پایہ معلوم ہوتے ہیں۔

غالب کی ایک بہت مشہور شوخی و ظرافت سے لبریز غزل جس کا مقطع ہے:۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

اسی غزل کا یہ شعر ہے:۔ ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایکدن

اس کے متعلق شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مولف آب حیات لکھتے ہیں کہ غالب مہاجنوں کے قرضدار ہوگئے۔ ادائیگی کی کوئی صورت نہ بنی تو عاجز آکر قرض خواہوں نے ان پر نالش ٹھونک دی۔ غالب جوابدہی کے لئے عدالت میں طلب کئے گئے۔ مفتی صدرالدین آزردہ کی عدالت میں پیشی تھی۔ غالب جب حاضر عدالت ہوئے تو یہ شعر پڑھا۔ قرض کی پیتے تھے مے ..... الخ حاکم عدالت نے مدعیان کو روپیہ اپنی گرہ سے ادا کرکے مقدمات فیصل کردیے اور اس طرح غالب قرض کی گراں باری سے سبکدوش ہوگئے۔

غالب کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ ہو:۔ ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

نار بمعنی آتش دوزخ، التہاب، شعلوں کا بھڑکنا۔ فرماتے ہیں، محبوب کی برخوئی بھی میرے لئے سامان راحت ہے اگر میں ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں دوزخ کی آگ بھی شعلہ زنی اور بھڑکنے میں اس کی خو سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس لئے میرے لئے سامان راحت ہے۔ عشق کا ایمان یہی ہے۔ اس شعر میں غالب کا خاص رنگ جھلکتا ہے۔ اب اسی غزل کا دسواں شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

شعر پیچیدہ نہیں سیدھا سادہ ہے مطلب یہ ہے کہ معشوق کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف، نگاہ کا چرانا ایک طرف، اسی طرح مصرعہ ثانی میں لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف، غصہ میں بگڑنا ایک طرف، دونوں مصرعے ہم پلہ اور اپنا آپ جواب ہیں بلکہ بے مثل ہیں۔ عاشق و معشوق کے مابین ہمیشہ ایسا ہی پیش آیا کرتا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے عاشق کی نظر میں آنکھ چرانا لگاوٹ سے بھی زیادہ دلفریب ہے اسی طرح معشوق بناؤ سنگار میں نہایت دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے مگر اس کا غصہ سے بگڑنا اس کے بناؤ سے زیادہ جاذب نظر ہوتا ہے۔ یہی مفتی آزردہ جن کا اوپر تذکرہ آچکا ہے کہ کلام کی سادگی و پرکاری پر دل و شیدا ہو جایا کرتے تھے، غالب کی پیچیدہ گوئی پر ہمیشہ سے حرف گیر تھے اس شعر کو سن کر بہت مسرور ہوئے مگر طنزاً یا بطور مزاح بولے "یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے اس میں مرزا کی کون سی خوبی ہوئی"

غالب کی ایک غزل کا مطلع ہے۔ ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اس غزل کا مقطع تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ ؎

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو۔ میں

غالب کو نواب علی بہادر خاں والیٔ باندہ نے اپنے یہاں مدعو کیا تھا

ایک مکتوب میں انوار الدولہ شفق کو تحریر فرماتے ہیں۔

"باندہ بندیل کھنڈ آنے کا میں نے سب سامان کر لیا۔ ڈاک میں

روپیہ ڈاک کا دے دیا قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا

وہاں سے نواب علی بہادر خاں کی سواری میں باندے جا کر ہفتہ

بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا بسبیل ڈاک دلی

چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا بیمار ہو گئے (بہادر شاہ ظفر) اور

مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا"

؎ وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالع شوق مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

غالب نے ایک مکتوب شاہ عالم مارہروی کو تحریر کیا۔

"مشفقی اکرمی چودھری عبد الغفور صاحب کو میرا سلام کہیئے گا

اور یہ پیام پہونچائیے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار

بقیہ مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے

یعنی خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں" مصرعہ ثانی خفیف ترمیم

کے ساتھ تحریر کیا۔

مکتوب بنام نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور۔ بعد تسلیم

معروض ہے کہ جب بادشاہ دلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا

اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر کہی مقطع اس کا یہ ہے۔ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا۔ وہ دن گئے کہ کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں۔ اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ۔ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل ۔ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے ۔ لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے ۔ آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ۔ لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ ۔ رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے ۔ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قطعہ

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم ۔ شائستۂ گدائے ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد ۔ خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

چند اشعار

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں۔ خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں۔ لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

تھیں[۵] بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں۔ شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں
قید[۶] میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر۔ لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں

یہ غزل دلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا جناب مرزا نورالدین بہادر جو لکھنؤ سے تشریف لائے تھے اور شاہزادہ والا تبار رونق محفل مشاعرہ تھے۔ ایک غزل مرزا ئے ممدوح یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں غالب کی راقم اخبار کے پاس پہنچی جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔

غالب منشی نبی بخش حقیر کو بھی اس غزل کے متعلق رقم طراز ہیں:۔

"بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر یہ ریختہ ہے تو میر و میرزا کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے! صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزادگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی"

[۵] شمال کی جانب سات ستارے آسمان پر قطب شمالی کے قریب ہوتے ہیں ان کو لڑکیاں کہتے ہیں اور ہندوستان میں سات سہیلیوں کا جھمکا کہا جاتا ہے چار ستاروں کو جنازہ اور تین کو جنازہ لے جانے والے بیان کیا جاتا ہے یہ سات لڑکیاں (بنات النعش) شرم وحیا کا ثبوت دینے کے لئے دن بھر تو آسمان کے پردے میں پوشیدہ رہتی ہیں مگر رات کو انھیں کیا ہوتا ہے اور ان کے جی میں کیا آتی ہے کہ عریاں و بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔

؎ روزن دیوار زنداں آنکھوں کا بے نور ہونا اظہار کرنا بہ مقصود ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے یوسفؑ کی خبر نہ لی۔

منشی نبی بخش حقیرؔ سے غالب کو جو دالہانہ لگاؤ، التفات وانسیت تھی اس کی جھلکیاں جا بہ جا غالب کے خطوط میں ملتی ہیں جو ان سطور سے قبل خطوط مندرج ہوئے ہیں اور آئندہ صفحات پر مزید آئیں گے۔ منشی نبی بخش کے اخلاق و عادات سے متعلق کچھ روشنی نہیں پڑتی ہاں اتنا مترشح ہوتا ہے کہ وہ آشنا پرور نیز احباب نواز تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند خدا رسیدہ۔ غالب مرزا تفتہ کو ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"بارے اب کہیے۔ بھائی منشی نبی بخش حقیر صاحب اور مولوی قمرالدین خاں صاحب روزوں کے متوالے ہوش میں آئے یا نہیں؟ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظر سے گزرا تو شاید وہ مجھ کو خط لکھیں"۔

منشی نبی بخش بھی غالب ہی کی طرح ایک عرصہ دراز سے احراق اور امراض سوداویہ میں مبتلا چلے آتے تھے لیکن ان کے مرض الموت کی نوعیت و کیفیت نہیں معلوم ہو سکی۔ مکتوبات میں ۱۸۶۱ء کے بعد ان کی علالت کا تذکرہ نہیں آیا دن کے تعین کے لئے تو کوئی شہادت مل نہ سکی لیکن یقین ہے کہ ان کی رحلت اکتوبر ۱۸۶۱ء میں کسی تاریخ کو واقع ہوئی۔ ان کے انتقال کا جتنا ملال غالب کو ہوا وہ تو ان کے دل پر ہی گزرا ہوگا۔ البتہ انھوں نے مرزا تفتہ کے اصرار پر ایک قطعہ تاریخ وفات لکھ کر مولوی قمرالدین کو بھیجا تھا جو مولوی موصوف

نے ناپسند فرمایا۔

۱۹ر نومبر ۱۸۶۰ء کو غالب نے تفتہ کو اس کی مفصل کیفیت اس طرح قلم بند کی ہے :۔

"فن تاریخ کو دوں مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہو جاتا ہے۔ بہر حال میں نے منشی نبی بخش حقیر مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمرالدین خاں صاحب نے ناپسند کیا قطعہ یہ ہے " :۔

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق
داشت مذاق سخن و فہم و تیز

مرگ ستم پیشہ امانش نہ داد
کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز

سال وفاتش زپے یادگار
با دل زار و مژہ دجلہ ریز

خواستم از غالب آشفتہ سر
گفت، مدہ طول بگو رستخیز

ایک قاعدہ یہ ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے جیسا کہ یہ مصرع۔ ع در سال عرس ہر کہ ماند بعید انوری کے قصائد کو دیکھو دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدہ کے آغاز میں لکھے

ہیں جنہیں اعداد و سال مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "تحیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور بر موقع کے مناسب! اگر تاریخ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ مستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجب ادائے حق مودت ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا کروں۔"

نومبر ۱۸۶۰ء میں جب منشی نبی بخش حقیرؔ کا انتقال ہوا تو تفتہؔ کی فرمائش پر غالبؔ نے مندرجہ بالا قطعہ کے علاوہ ذیل کی تاریخ وفات بھی لکھی۔ یہ قطعہ انھیں بہت پسند تھا:

دگر گر گریہ کند سر بمرگ مازیان | دگر کرانش اینگونہ باد ہو بجکد
بود حقیر بہ فن محبت آں یکتا | کہ خوں شود دل ما و ز چشم او بچکد

غالبؔ کا جس دور سے تعلق تھا اسمیں ہر ذی علم سے توقع کی جاتی تھی کہ اسے ہیئت، فلسفہ، تصوف، فن شعر و سخن، طب اور دیگر رائج الوقت علوم سے کم و بیش لگاؤ یا واقفیت ضرور ہو، بر ایں بنا غالبؔ نے بھی اس دور کے رواج کے مطابق منجملہ مذکرہ علوم علم طب کا بھی مطالعہ کیا ہوگا۔ لیکن اسے حسن اتفاق کہیئے کہ ان کے حلقۂ احباب میں شاہی اطبّا بھی شامل تھے۔ مرزا صاحب خود دائم المرض تھے اس لئے مختلف امراض اور ان کے علاج معالجہ کی تدابیر و ادویہ پر تبادلہ خیالات ہوتے رہتے ہوں گے۔ اس طرح ایک تو ان کو نامی گرامی اطبا، کی صحبت سے فیض پہونچتا رہا ہوگا دوسرے طب پر بعض اہم کتب کے مطالعہ کے مواقع ہاتھ آتے ہوں گے۔ ناظرین کی تفنن طبع کے لئے ایک دلچسپ بات قلم بند کردینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھر گڈھی حیدرآباد) کے کتب خانہ کی ایک کتاب موسومہ "ذخیرہ دولت شاہی" پر غالب کی مہر ثبت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ کتاب ضرور ان کے زیر مطالعہ رہی ہوگی۔ مرزا تفتہؔ کو ایک مکتوب میں منشی نبی بخش حقیرؔ کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتے ہوے "طب محمد حسین خانی" کا حوالہ دیا

دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کا بھی انھوں نے بامعان نظر مطالعہ کیا ہوگا۔ علم طب پر اس نوع کی دیگر معیاری کتابیں اغلب ہے کہ ان کے زیر مطالعہ رہی ہوں گی۔

غالب کی تصنیفات میں علم طب سے آگاہی کی سب سے پہلی شہادت مرزا ابوالقاسم خاں کو مسہل لینے کا پانچ اشعار کا ایک قطعہ درج ذیل ہے۔ غالب نے ابوالقاسم خاں کو مسہل لینے کا مشورہ دیا جس سے انھیں بہت فائدہ ہوا اور تشکر کے طور پر یہ مختصر قطعہ لکھ کر انھوں نے غالب کو ارسال کیا۔ ؂

اے مسیح زماں تو می دانی
بہ جنابت ارادتے کہ مراست

بوعلی کی رسد بہ تشخیصت
کہ فلاطوں مثال تو داناست

مے سزد، گر بگویمت بقراط
در فلاطوں بخواندمت زیباست

مُسہلے دادی و بغرمودی
بہ عمل آر بیگماں کہ شفاست

زاں عمل دور شد مرض بالکل
گر بگویم توئی مسیح بجاست

اس کے جواب میں غالب نے دو قطعے تحریر فرمائے، دوسرے قطعہ میں رقم طراز ہیں۔ ؂

بو علی و مسیح و افلاطون	ہر چہ گفتی بگو کہ از تو سزاست
بے ادب باشم از کنم تکذیب	جی فرو باشم ار شمارم راست
نسبت من بہ بو علی سینا۔	صاف ہم چوں سراب بادریاست
بو علی گفتنم روا باشد	خرس در کوہ، بو علی سیناست

ایک بار نواب کلب علی خاں مرحوم سابق فرمانروائے رامپور نے غالب کو اپنی ناسازی طبع کا حال تحریر فرمایا۔ انھوں نے عوارض کی تفصیل کے پیش نظر اپنی تشخیص کے مطابق نسخہ[1] تجویز کیا جو ان کے مکتوب میں درج ہے۔ اسی طرح ہرگوپال تفتہ نے غالب کو منشی بنی بخش کی علالت کا حال تحریر کیا ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا کہ ماءالجبن سے آرام نہیں ہوا۔ غالب کا ذہن فوراً (طب محمد حسین خانی) کی جانب منتقل ہوا جس کے حوالہ سے نسخہ لکھ بھیجا۔[2] ان تحریروں کے مطالعہ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ غالب نے نہ صرف علم طب پر بہت سی کتب کا مطالعہ کیا تھا بلکہ انھیں بہت سے نسخے بھی زبانی یاد تھے اور انکی ترکیب استعمال، پرہیز اور غذا کی مناسبت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مریض کو دیکھے بغیر عوارض کی تفصیلات معلوم کرکے مرض کی تشخیص کر سکتے تھے اور مناسب نسخہ تجویز کر سکتے تھے۔ یہ اوصاف ایک طبیب حاذق ہی سے متصف ہو سکتے ہیں۔ یہ دیگر امر ہے کہ غالب نے اسے اپنا پیشہ نہ بنایا نہ طبابت ہی اختیار کی۔ یہاں ان مکتوبات کے حوالے حاشیہ میں دے کر اکتفا کی گئی ہے گو اس ضمن میں کافی ذخیرہ ملتا ہے مگر چونکہ اس کتاب سے متعلق نہیں اس لئے غیر ضروری سمجھ کر ترک کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح فن تاریخ نویسی کے سلسلہ میں جو ان کی

کاوشیں ہیں ان کا تذکرہ بھی یہاں پر غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ خواجہ حالی مرحوم نے مہر نیم روز اور ماہ نیم ماہ کے سلسلہ میں کافی مواد قلم بند کر دیا ہے نیز شیخ محمد اکرام نے "آثار غالب" میں اس پر کافی لکھا ہے۔ غالب نے تاریخ نویسی کے سلسلہ میں ایک شعر لکھا ہے وہ چونکہ ان کے مکتوبات میں مندرج ہے اس لئے اس پر روشنی ڈالنا مقصود ہے کہتے ہیں

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

اس سلسلہ میں وہ منشی نبی بخش کو مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کے دن لکھتے ہیں:۔

"میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کر کے نذر کیا اس کا حال سنیئے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا۔ اب شروع تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے میں نے کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا جلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک۔ اس کا نام 'مہر نیم روز' رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والی عصر تک' اس کا نام 'ماہ نیم ماہ' سو وہ مہر نیم روز تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کرے گی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائے گا۔ توقیع خوشنودی مجھ کو مل گیا۔ یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت۔ اسی کو خلعت فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں مجھ میں کہیں جانے کا دم نہیں۔ اگر بادشاہ کا توسل نہ ہوتا تو بھی یہیں پڑا رہتا۔ بس میں اس کو غنیمت جانتا ہوں۔ ہمارا قدرداں کون کہ

میں اس پر ناز کروں۔ بقول ذوق کے "جو سمجھے وہ ہمارا غلام جو نہ سمجھے ہم اس کے غلام"۔ ؎

زندگی بر گردنم افتاد بیدل چارہ نیست چار باید زیستن نا چار باید زیستن

اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش کو حکیم مومن خاں مومن کی وفات کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں، قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا بہ رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تیتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس کی عمر تھی کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست بھی ہات آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"

مومن خاں ــــ حکیم مومن خاں مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے ان کے اسلاف سلطنت مغلیہ کے دور آخر میں دلی آئے اور شاہی اطبا میں شمار کئے گئے انھیں سرکار انگلشیہ سے پنشن ملتی تھی۔ بچپن ہی ذہین اور طباع واقع ہوئے تھے۔ حافظہ زبردست پایا تھا جو بات سُنتے، یاد ہو جاتی تھی۔ علم نجوم میں بھی کمال کا درجہ رکھتے تھے۔ خوش رو، خوش وضع اور عاشق مزاج واقع ہوئے تھے عنفوانِ شباب کا کلام عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر عمر کے کلام میں پختگی و متانت نے جگہ لے لی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ غالب کے ہم عصر تھے۔ ان کے انتقال پر غالب نے ذیل کی رباعی کہی تھی ؎

خونابہ بہ رخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر خسرت کردی دلی خراشم ہمہ عمر
چوں کعبہ سیہ پوش بناشم ہمہ عمر کافر باشم، اگر بہ مرگ مومن

رشک کا مضمون غالب کو بڑا مرغوب تھا۔ اس مضمون کے انھوں نے بہت سے اشعار کہے ہیں، ذیل کے شعر میں انھوں نے اس مضمون کو کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا ہے ؎

[illegible] کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"شفیق میرے، مشفق میرے، کرم فرما میرے، عنایت گستر میرے، تمہارے ایک خط کا جواب میرے اوپر قرض ہے۔ کیا کروں سخت افسردہ و ملول رہتا ہوں مجھکو اس شہر کی اقامت ناگوار ہے۔ اور موانع اور عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا خلاصہ میرے رنج والم کا یہ ہو کہ میں اب مرنے کی توقع پر جیتا ہوں بہات

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے"

غالب کے قلعہ سے مراسم کا سلسلہ اس فارسی قصیدہ سے ملتا ہے جو اکبر شاہ ثانی کی مدح میں لکھا گیا تھا اس کا مطلع ہے:۔

درین زمانہ کہ کلک رصد نگار حکیم ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم

یہ قصیدہ مارچ ۱۸۳۵ء کی تصنیف ہے اس لئے ان کے بے ضابطہ تعلقات ۱۸۳۵ء سے قبل بھی ہوں گے لیکن یہ تعلقات مختلف تقاریب میں شرکت تک محدود تھے۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ کے سال جلوس کے موقع پر غالب نے جو فارسی قصیدہ لکھا تھا اس میں "قرب شاہ" کی خواہش ظاہر کی گئی تھی:۔

خواہیم قرب شاہ ولیکن دریں مراد۔

عبرت ز نامرادیٔ سنجر گرفتہ ایم۔

مگر قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوق اور ان کے حلقہ کے لوگ غالب کی رسائی میں رخنہ انداز تھے اور بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے چنانچہ غالب کے دوسرے قصائد کا انداز بھی معذرت آمیز ہے اور اکثر میں دربار سے

دوری کی شکایت پائی جاتی ہے۔ شاہی ملازمت سے منسلک ہونے کے بعد
بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو غالب کا پہلا فارسی قصیدہ ہے اس میں انھوں نے
اپنی وفاداری اور عقیدت مندی کا اس طرح یقین دلایا ہے:۔ ؎

گفتم حدیث دوست بقرآں برابر است
نازم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر است

جو مشاعرہ قلعہ معلی میں ۲۵ر فروری ۱۸۵۲ء کو ہوا اس سلسلہ میں غالب
میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:۔ (۱

"جمعہ کی شب کو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں۔
شہزادے اور دوسرے لوگ اتنے جمع ہوئے کہ نشست گاہ میں
بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ پہلے ذوق نے بادشاہ کی غزل سنائی۔ پھر
شاہزادہ حضرت سلطان نے اپنی غزل پڑھی۔ پھر دوسرے
شاہزادوں نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے بھی اپنی غزل پڑھی اور
ایک بہانے سے اٹھ کر گھر آگیا۔ دکانیں کھلی تھیں۔ چراغ جل رہے
تھے۔ شراب پی کر سو گیا۔ صبح قلعہ گیا۔ شاہزادہ حضرت سلطان
مرزا حیدر شکوہ مرزا نورالدین اور مرزا عالی بخت عالی کی رات
والی غزلیں سنیں اپنی غزل سنائی، وہیں معلوم ہوا کہ مشاعرہ رات بھر
جاری رہا اور آخر میں ذوق نے غزل پڑھی۔ بادشاہ نے ایک
فارسی اور ایک ریختہ کا مصرعہ طرح دیا۔ فارسی کا مصرعہ تھا:۔ ع

[illegible]

ریختہ کا مصرعہ تھا۔ ؎ "خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے"
غالب ۱۵ اگست ۱۸۵۴ء کو منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:۔
"مرزا یوسف علی خاں کہتے تھے کہ آپ اس قصیدے کے طالب ہیں
جو بہ طرق مرثیہ لکھا گیا ہے اور اس میں شاہ اودھ کی مدح مندرج
ہے اگر ہاتھ آگیا تو چھاپے کا ورنہ قلمی بھیج دوں گا۔ بادشاہ اودھ
تک پہونچ گیا ہے اگر کچھ ظہور میں آیا تو وہ بھی تم کو لکھوں گا۔
پھر ۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہیں:۔
"ہاں صاحب! یوسف علی خاں نے لکھنؤ والے قصیدہ کا چھاپا جہاں
خاں کی معرفت تم کو بھیجا ہے۔ نہیں جانتا جہاں خاں کون ہے!
یوسف علی خاں کی زبانی لکھتا ہوں۔ پس اگر پہونچ گیا تو خیر ورنہ
تم جہاں خاں سے مانگ لو۔"
غالب کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصیدہ مذکور جولائی یا داخل اگست
میں نہ صرف پیش ہوا بلکہ چھپ بھی گیا۔ قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔ ؎

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی	کہ در روے آدم آلِ عبا را ساربان بینی
بہ بینی سرخوش خوابِ عدم عباس غازی را	زمشکش درخم بازو نہ تیرش در کماں بینی
نہ بینی کہ چوں جاں داد از بیداد بدخواہاں	علی اکبر کہ ہمچو بخت بدخواہش جواں بینی
چہ دنداں در جگر افشردہ باشی کاندراں وادی	حسین ابن علی مادر شمار کشتگاں بینی

اس سلسلہ میں غالب لکھتے ہیں کہ بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کی سرکار
سے ان کے لئے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سالانہ مقرر ہوئے لیکن وظیفہ مقرر

ہونے کے بعد سلطنت اودھ دو برس سے زیادہ قائم نہ رہی۔

غالب دورِ جوانی تک تو بہت تندرست رہے لیکن شراب نوشی کی عادت نے صحت کو بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ جوانی کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ شراب کے برے اثرات رنگ لانے لگے اور امراض زور پکڑتے گئے۔ غدر کے بعد کے مکتوبات میں تو بیماریوں کا ذکر عام ہے لیکن ان کی اس سے پیشتر کی بیماری کا حال نہیں معلوم ہو سکا۔ ایک خط میں تفتہ کو مرقومہ مارچ ۱۸۵۴ء میں لکھتے ہیں کہ ان دنوں تپ و لرزہ میں مبتلا ہوں۔ خطوط سے غالب کی ۱۸۶۰ء تک کی بیماری، داڑھ ہلنے کے گرنے کا حال، گراں گوشی، سامعہ اور شامہ کی شکایت۔ اس سے قبل ہے وہ احتراق اور فسادِ خون سے پیدا شدہ امراض میں مبتلا تھے موسمِ بہار میں اسکی شدت ہو جاتی تھی جس کی نشان دہی اس شعر سے ہوتی ہے:۔

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھئے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیئے

ایک جگہ منشی نبی بخش کو لکھا ہے:۔

"رات کو ایک غزل کئی برس کے بعد لکھی ہے۔ اب صبح دم تم کو لکھتا ہوں خدا کے واسطے غور کرنا کہ غزل اس کو کہتے ہیں"

غالب نے اسی زمانہ میں ایک فارسی قطعہ لکھا تھا جس میں اردو کو اپنی زبان کہا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ان پسندیدہ خوئے عارف نام
گرزخش شمع دودمانِ منست

جائے دارد کہ خویشش را نازم　　　که فلانی ز پیروان من ست

جاوداں باش کہ اے در گیتی　　　سخنت عمر جاودان من ست

اے کہ میراث خوار من باشی　　　اندر اردو کہ آں زبان من ست

حقیقت بھی یہی ہے کہ غالب کو اس دور کی شاعری نے اردو کا سب سے عظیم المرتبت شاعر منوالیا تھا۔

غالب طبعاً آزاد واقع ہوئے تھے ہر نوع کی تنگی دپابندی ان کے لئے بلائے جان تھی ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کے باعث جو فرائض اور پابندیاں ان پر عائد ہو گئی تھیں انھیں وہ ایک شریف آدمی کی طرح پوری کرتے رہے لیکن اس سے وہ کبھی خوش نہیں رہے انھوں نے اپنے مکتوبات میں متعدد مقامات پر شادی کو حبس دوام سے، زوجہ کو پھانسی کے پھندے طوق اور بیڑیوں سے اور حسین علی خاں و باقر علی خاں پسران نواب زین العابدین خاں عارف کو اسی آہنی کی دو ہتکڑیوں سے تعبیر کیا ہے۔ امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی خبر پاکر ایک خط ۱۹ دسمبر ۱۸۵۹ء کو تحریر کیا۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے"

تاہل کی زندگی سے تنفر کا ایک جگہ اور اس طرح اظہار کیا ہے:۔

"بھائی میرا ذکر سنو! ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہر ایک کو تنہائی سے نفور ہے۔ ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں میری سبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولت تنہائی میسر آجاتی لیکن اس تنہائی چند روزہ تجرید مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا۔ شکر بجا لاتا تھا۔ خدا نے میرا شکر منظور نہ کیا یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں:۔ ؎

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری
دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری

زیں گونہ کہ تند مے خرامی دانم
در خانہ زنے تیزہ خوئے داری

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود
از غصۂ فراغتش ہمانا نبود

دارد بجہاں خانہ و زن نیست رود
نازم بخدا چرا توانا نبود ـــ

ذیل کے قطعہ سے زن و شو کے مابین ناچاقی کا سراغ ملتا ہے:۔ ؎

گبر کہ در روز حشر چوں تو نبینی
بر سر دوزخ نہندہ ترہ نہنبن

وال کہ نباشد در آں مضیق مصیبت
در طلب نان و جامہ کشمکش از زن

وال کہ نباشد در آں مقام صعوبت
شور تقاضائے نار وائے مہاجن

ایک قطعہ اور ملاحظہ ہو:۔

بہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت
سپردند از رہ تکریم و تذلیل

ولیکن در اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

منشی نبی بخش حقیر کی بہو یعنی عبداللطیف کی زوجہ اول رحلت کر چکی تھی۔ عقد ثانی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ غالب حقیر کو لکھتے ہیں:۔

"بھائی اس غریب کو بند تاہل میں پھنساتے ہو۔ بقائے نام کے واسطے خدا جیتا رکھے عبدالسلام و کلثوم کافی ہیں۔ میں تو بھائی ابن یمین کا معتقد ہوں" ؎

مرد آں بہ کہ بہ دنیا نکند میل دو کار
بہ جہاں ہر کہ طلبگار سلامت باشد

زن نخواہد اگرش دختر قیصر بدہند
وام نستاند اگر وعدہ قیامت باشد

کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا جی نہ چاہتا ہو اور تم زبردستی اس بلا میں پھنساتے ہو۔ اس کے ہم رازوں سے اس کا مافی الضمیر معلوم کر لو۔ اگر وہ بھی راضی ہے تو خیر ورنہ میرے نزدیک تو جبر ہے"

قطعہ در مدح سید الشہداء:۔ ؎

معذوریٔ ارزحادثہ رنجی ازاں کہ نیست۔ از ناز کی بہ طبع گوارا گریستن
سکین نہ دیدہ زمغاں شیوہ بالواں۔ در خواب گاہ بہمن و دارا گریستن

یہ دونوں اشعار اس قصیدے کے ہیں جو غالب نے میر نظام الدین ممنونؔ کے ایک مشاعرے میں پڑھے تھے۔ یہ مشاعرہ شاہ صاحب کے قدیم مدرسہ میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ حاضرین مشاعرہ پر اس قصیدہ سے اتنی رقت طاری ہوئی کہ بزم مشاعرہ مجلس عزا بن گئی۔ اسے اعجاز سخن کہیئے کہ اسی لمحہ مینہ برسنے لگا اور عجیب سماں بندھ گیا۔ مفتی صدر الدین آزردہؔ بھی شریک بزم تھے، غالب جب قصیدہ پڑھ چکے تو آزردہؔ نے کہا کہ:۔ "آسماں ہم گریست"

مندرجہ بالا قصیدہ کی داد غالب کو بصرہ کے عربی و عجمی حضرات سے بھی حاصل ہوئی۔ سید اکبر مرزا نے بصرہ کی ایک بزم عزا میں اس قصیدہ کے چند اشعار پڑھ دئیے بارش ہو رہی تھی۔ چند ہی اشعار کے بعد خوب رقت ہوئی اس بزم عزا کے شرکا میں عرب، عجم اور ہند سب ہی ممالک کے حضرات تشریف فرما تھے۔ بہت داد ملی۔ خاص طور سے اس شعر کی بہت ہی تعریف کی گئی:۔ ؎

مُزدِ شفاعت وصلۂ صبر و خون بہا ہیچ از کسے نہ خواستہ اِلّا گریستن

کہتے ہیں کہ مرزا دبیر کو بھی یہ شعر بہت پسند تھا اور انھوں نے اس پر مصرعے

بھی لگائے تھے لیکن پسند نہ آئے تو کہا کہ جس مرتبہ کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکے۔ اس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

رشک ایدم بہ ابر کہ در حد وسع اوست۔ برخاک کربلائے معلےٰ گریستن
رفت آنچہ رفت، ایدم اکنوں نگاہ داشت۔ از بہر نور دیدۂ زہرا گریستن
گویند چشم روشنیٔ دیدہ ماہ و مہر۔ نازد بہ ماتم شہ والا گریستن
پاس ادب نخواست کز اعجاز دم زند۔ بر مرگ شاہ داشت مسیحا گریستن
باخاکیاں بہ جنگم و افلاکیاں بہ رشک۔ خواہم بر آستانِ تو تنہا گریستن

(از کلیات فارسی صفحہ ۱۹۲)

ایک مکتوب میں منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھتے ہیں:۔

"مغاں شیوہ بانواں۔ بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف نون کا جمع ہے۔ یعنی بیپالہ مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل و رخسار اور ماہ جبیں کی ترکیب ہے۔ یعنی وہ شخص کہ جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی ہے اور شیوہ مغاں کا سا ہے مغ آتش کدہ کا کارفرما اور چونکہ بادشاہانِ پارس[1] آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدوں کے عمائد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے اور شراب کو چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک و متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے یہ بھی مغوں کی تحویل میں رہتی تھی تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل

[1] زمانۂ قدیم میں ایران کو پارس کہتے تھے (عارف)

جانیں اس کو بقدر مناسب دیں بہرحال وہ لوگ یعنی مغ بہت
خوبصورت اور خوش سیرت، عالم، فاضل، طرحدار، بذلہ گو، حریف
ظریف ہوا کرتے تھے۔ اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ مدح
معشوق کی ٹھہرائی ہے۔ یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور
ترچھا بانکا مانند مغوں کے اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہے
کہ جیسے کسو بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت
میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے۔ قصہ مختصر مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے
ہیں کہ جو بہت گرم اور شوخ اور شیریں حرکات اور چالاک ہو۔
مغاں شیوۂ بانواں۔ مغاں شیوہ دلبراں۔ مغاں شیوۂ شاہداں
خواہی بہ جمع خواہی بہ انفراد ترکیب مقلوب ہے یعنی بانوے
مغاں شیوۂ یا بانوانِ مغاں شیوہ قیس اعلیٰ ہذا اور الفاظ ۔"
حاصل معنی یہ کہ شاعر اپنے نفس کو یا کسو اور کو مخاطب کرکے کہتا
ہے کہ تو معاف ہے اگر وقائع وحوادث دہر سے آزردہ ہوتا ہے
اس واسطے کہ تو بہت نازک ہے اور گریہ وزاری کی شدت کا
متحمل نہیں ہو سکتا یہ بیان بہ سبیل طعنہ و تعریض واقع ہے جیسا
کہ دوسری بیت میں کہتا ہے کہ اے شخص تو نے خواب گاہ بہمن و
دارا میں پریزاد و نازک و مغاں شیوہ بیگمات کو روتے پیٹتے
نہیں دیکھا کہ کیسے بادشاہانِ جلیل القدر کی بیبیاں تھیں اور
کیسی طرحدار نازک مزاج کہ جیسے مغ ہوتے ہیں اور پھر ان پر

کیا مصیبتیں گزریں۔ ظاہرا تو نے یہ قصہ کتب تواریخ میں نہیں
دیکھا۔ اور وجہ بہمن و دارا کے نام خاص کی یہ ہے کہ بہمن ابن
اسفندیار کو آغاز شباب میں اژدہا نگل گیا ہے اور دارا ابن داراب
ابن بہمن عین جوانی میں سکندر اعظم کی لڑائی میں اپنے دو مصاحبوں
کے ساتھ مارا گیا"۔ اسد اللہ۔ جون ۱۸۴۹ء

نور نظر لخت جگر مرزا تفتہ تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم
رائے امید سنگھ بہادر یہ رقعہ تم کو بھیجیں گے تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی ان کے
پاس حاضر ہو جانا اور جب تک وہاں رہیں تب تک حاضر ہوا کرنا اور دستنبو کے
باب میں جو ان کا حکم ہو بجا لانا ان کو پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب
سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کریں گے وہ لے لینا جب کتاب چھپ چکے
دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں
بموجب ان کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا اور وہ جو میں پانچ جلد
کے آرائش کے باب میں تم کو لکھا ہے اس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔ ہاں
صاحب ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے اس رباعی کو چھاپہ ہونے
سے پہلے حاشیہ پر لکھ دینا۔ جہاں یہ فقرہ ہے ...... کہ نے اختر بخت خرد
زر بلندی بجائے رسید کہ رخ از خاکیاں نہفت ے

جائیکہ ستارہ شوخ چشمی ورزد افسر از فسار گر نہ ارزن ارزد
اندیشہ نہ اندیشہ جاذر گردش بر چرخ نہ بینی کہ چساں می لرزد

چونکہ حاشیہ معنی لغات سے بھرا ہوا ہے تو تم اس فقرے کے آگے نشان

بنا کر اوپر کے حاشیہ پر رباعی لکھ دیا اور حاشیہ میں جہاں اور معنی لکھے ہوئے ہیں وہاں رباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دیا۔ افسر[1] افسار[2]، گرزن[3]، (بہر دو فتح) جادر گردش[4]۔

غالب نگاشتہ ۲۸ اگست ۱۸۵۶ء

ایک خط منشی نبی بخش حقیر کو اپریل یا جون میں لکھتے ہیں جو اس طرح ہے:۔

"بھائی صاحب! یہ عنایت نامہ بھی پایا اور جس کی مجھے فکر تھی وہ بھی آیا۔ اختلاف مدت کا مدار بر کاروں کی طبیعت پر ہے۔ حال منشی عبد اللطیف اور ذکیہ معلوم ہوا گرمی کا موسم ہے میں جانتا ہوں ان دونوں کو زیر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا۔ کبھی کبھی شربت نیلوفر شربت بنفشہ۔ عرق نعناع کی سکنجبین۔ عرق کاسنی، عرق بادیان اسی طرح کی چیزیں گھر میں تیار کرو۔ گاہ گاہ استعمال میں آتی رہیں ہاں صاحب! نصیر الدین کا ذکر اپنے خط میں بہت دنوں سے نہیں لکھا۔ مگر وہ بھی کہیں ہمارے شیخ اکرام الدین کے ساتھ آگرے چلا گیا۔

آپ کی کتاب کی فکر میں ہوں اگر اجل امان دیتی ہے تو اب لکھ کر بھیجے دیتا ہوں۔ ہمایوں کا حال پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو میں آیا ہے اب ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور[5] میں جاتا

---

[1] تاج۔ [2] پوشش۔ [3] تاج۔ [4] تغیر حال [5] شاہ دلی

ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں سو وہ کبھی ہوئی
غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کرلے جاتا ہوں آج میں نے
دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا تم کو بھی
لکھتا ہوں۔ داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو۔ پہونچے تو
اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل،؎

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے　　ایک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"
ہوں کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت　　کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم　　آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین　　ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے　　ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　　اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر　　اچھے رہے آپ اس کر مجھکو بھی ڈبو آئے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

خط کے متن میں اگرچہ ایک ہی غزل کا تذکرہ ہے مگر مکتوب میں دو غزلیں
مندرج ہیں۔ دوسری غزل ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے　　کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل　　اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے — کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اُسنے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے — تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مکتوب بنام مرزا تفتہؔ

"رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور۔ پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر کرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہرؔ کی جناب میں میرا سلام اور یہ شعر میری زبان سے پڑھنا ؎

شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب — اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمانِ من است

مکتوب ستمبر ۱۸۵۱ء بنام منشی نبی بخش حقیرؔ:۔ "بھائی صاحب! آپکا خط بہت دن کے بعد آیا خیر و عافیت معلوم ہوئی، دل خوش ہوا، اب ہوا سرد ہو گئی ہے انشاء اللہ تعالیٰ شیخ اکرام الدین بھی مع الخیر آجاویں گے۔ ایک خط کا جواب جو دیر میں لکھا ہے اس سبب سے لکھا کہ تقریب عید قریب آگئی تھی قصیدے کی فکر میں سرگرداں تھا بارے عید سے پہلے قصیدہ پڑھ چکا اب جواب آپکے خط کا لکھا۔ لکھو گے قصیدہ کیوں نہیں بھیجا۔ بہتر شعر ہیں اور حرف میں لکھنے والا۔ یہ لکھنا فکر شعر سے کم نہیں۔ انشاء اللہ لکھوں گا اور بھیج دوں گا۔ تحریر تاریخ اسی سبب سے ملتوی رہی اب اس طرف متوجہ ہونگا اکے واسطے لکھوا تا ہوں کاتب کے آگے کا ضروری

فرمائش سے حاکم کی آگئی ہے اسکو وہ تمام کرے تب اس تحریر کی
طرف توجہ کرے آپ خاطر جمع رکھیں جب تک آپ کے پاس نہ پہنچ
لے اور آپ اس کو دیکھ نہ لیں تب تک خود میرا دل خوش نہ ہوگا
ع۔ وائے بر جان سخن گر بہ سخن داں نہ رسد
تاریخ کا حال کیا پوچھتے ہو صرف ہمایوں کا حال لکھ چکا ہوں
اکبر بادشاہ کا احوال شروع بھی نہیں ہوا ہے۔ بھائی مجھ سے
یہ درد سر ہو نہیں سکتا بس یہ اتنا ہی رہا۔ ایک کاتب ہیں بہت
خوش نویس اور صحیح نویس ان کو میں نے مسودے دیے اور
ان سے کہا کہ اس کی دو نقلیں مجھ کو کر دو ایک تمھارے واسطے
اور ایک جانی بانکے لال کے واسطے۔ وہ ایک لکھ لائے میں نے
وہ جانی جی کو بھیج دی۔ خیال کیا کہ بھائی کو دس روز کے بعد
بھیج دوں گا۔ ناگاہ کاتب کو ایک کتاب تاریخ کی سشن جج نے
لکھنے کو دی۔ وہ لکھ رہے ہیں اس سبب سے درنگ ہو گئی ہے
آپ گھبرا دیں نہیں ؎

جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
باگرد فرش وسینہ بہ ایواں برابراست

ترکیب الفاظ یوں ہے کہ شرک فی الوجود باگرد فرش برابراست و سینہ
بہ ایوان برابراست یعنی دل بہ منزلہ ایوان کے ہے اور شرک فی الوجود بمنزلہ گرد
فرش کے ہے اس گرد فرش کو جھاڑا چاہیے۔ گرد جھاڑنے میں جھاڑو سے لا،

نافیہ کو جھاڑو مقرر کیا خلاصہ یہ ہے کہ لا نافیہ کی جھاڑو لا اور دل کے ایوان سے شرک فی الوجود کی گرد جھاڑ ڈال. اب سمجھئے کہ شرک فی الوجود کیا اور لا نافیہ کیا. شرک کئی قسم پر ہے. شرک فی الصفات، شرک فی الافعال، ان شرکوں کو سب جانتے ہیں مگر شرک فی الوجود بہت پوشیدہ ہے اور سب اس میں مبتلا ہیں یعنی اشیاء کے واسطے وجود جداگانہ قرار دینا اور خلق اور خالق کو الگ الگ سمجھنا مذہب وحدت وجود کا یہ ہے کہ موجود حقیقی حق ہے اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں. لاموجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ لا واسطے نفی کے ہے اہل ظاہر لا الٰہ الا اللہ کو یوں سمجھتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی لائق عبادت کے نہیں پس وہ نفی استحقاق عبادت کرتے ہیں اور صوفیہ کہتے ہیں کہ نہیں کوئی موجود سوائے اللہ کے. پس یہ لوگ اشیاء کی موجودیت کے عقیدہ کو شرک فی الوجود کہتے ہیں اور اہل ظاہر شرک خفی جانتے ہیں:۔ ؎

بالائے طفل یک شبہ در خم ز راستی
با قامت خمیدۂ پیراں برابر است

خیال میں ہوگا کہ یہ شعر منجملہ ان اشعار کے ہے جو ماہ نو کی تشبیہ میں واقع ہوئے ہیں. ایک تشبیہ یہ بھی ہے. طفل یک شبہ پہلی رات کا چاند. بالا یہاں بمعنی قد کے ہے نہ کہ بمعنی اوپر کے راستی بمعنی سچ کے ہے نہ بمعنی سیدھے کے:۔ ؎

بر دست شاہ تیغ و کماں راست جایگاہ
با تیغ و با کماں بہ چہ بر ہاں برابر است

واہ بھائی۔ تم اور اس شعر کے معنی پوچھو۔ یہ دو تشبیہیں ماہ نو کی ہیں۔ تلوار اور کمان۔ شاعر کہتا ہے کہ تلوار اور کمان بادشاہ کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہلال بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں پھر کس برہان سے اور کس دلیل سے شعرا اس کو تلوار اور کمان کے برابر جانتے ہیں:۔ ؎

دانم نہ تیغ مصقلۂ تیغ بادشاست
نشگفت گر بہ تیغ بدیں سال براراست

یہ بیت متعلق پہلی بیت سے ہے۔ پہلے شعر میں اپنے ایک شبہ وارد کیا کہ تلوار بادشاہ کے ہاتھ میں چاہیے اور ہلال وہاں نہیں ہے پس اس کو تلوار کیونکر کہیے۔ اب آپ ہی مجیب ہوتا ہوں کہ ہاں میں بھی جانتا ہوں کہ یہ تلوار نہیں بادشاہ کی تلوار کا مصقلہ ہے اور عجب نہیں کہ بادشاہ کی تلوار کا مصقلہ تلوار کے برابر گنا جاوے۔ ہاں یہ پوچھیے کہ مصقلہ کیا؟ مصقلہ آلہ ہے تلوار صیقل کرنے کا اور وہ ایک چیز ہے لوہے کی گھوڑے کے نعل کی صورت: ؎

تیغ مرا اگرچہ بود خفتہ در نیام
پولاد با بدخش بدخشاں برابر است

بدخش فارسی میں اسم ہے یاقوت کا اور یہ جو شہر کا نام بدخشاں ہے اسی سبب سے ہے کہ وہاں یاقوت کی کان ہے۔ "تیغ مرا" یہ جو "را" ہے یہ اضافت کے معنی دیتا ہے یعنی میری تلوار کی فولاد یعنی لوہا اگرچہ تلوار میان میں ہو لیکن یاقوت کے برابر ہے یعنی سرخ۔ اگرچہ تلوار نہ کھینچوں اور کسی کو نہ ماروں تو بھی میری تلوار خون آلودہ ہے اور مانند یاقوت کے سرخ ہے۔ خالق نے اس کی

سرشت میں یہ صفت ودیعت رکھی ہے"

"بھائی صاحب! آپ کے دو خط آئے پہلے خط میں آپنے ایک بیت کے معنی پوچھے ہیں۔ وہ سنیئے ؎

تو گوئی مگر مہر زیر زمیں فروزاں فزوہ بود پشت نگیں

یہ شب معراج کی توصیف میں ہے، کہ وہ شب ایسی روشن تھی۔۔۔۔۔

کہ بسبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی کہ جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے۔ آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے اور ڈانک بھی نگینے کے تلے لگاتے ہیں اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے پس جس نگیں کے نیچے آفتاب ڈانک ہوگا وہ نگیں کتنا درخشاں ہوگا فزہ فارسی لغت ہے بہ معنی ڈانک"

خط بنام مرزا شہاب الدین احمد خاں صاحب ثاقب دہلوی۔

"تمھارے بھائی کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ کلیات اردو جو تم نے خریدے ہیں ایک اس میں سے جا ہو اپنے چچا کے نذر کرو جا ہو بھائی کو تحفہ بھیجو اس وقت میں نے ان کے نام کا خط لوہارو کو روانہ کیا ہے بعد ارسال خط، مولوی سدید الدین خاں صاحب میرے ہاں آئے۔ اثنائے حرف و حکایت میں میں نے شاہین کی حقیقت پوچھی جواب دیا کہ ہاں عربی میں ایک بلجے کا نام شاہین ہے۔ صورت اس کی پوچھی گئی کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ صراح میں۔ میں نے دیکھا ہے فقط۔ تم جو مولانا علائی کو خط لکھو یہ رقعہ ملفوف کردو۔ غالب

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ثاقب حرکت یہ کی بے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دیکے بے وجہ جواب غالب کا پکا دیا کلیجہ تم نے

رباعی

اے روشنی دیدۂ شہاب الدین خاں کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

۲۸ اپریل ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں حقیر کو لکھتے ہیں :۔

"بھائی۔ یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے۔ پندرھویں کو اور انتیسویں کو۔ حضور فارسی کا ایک مصرعہ اور ریختہ کا مصرعہ طرح کرتے ہیں۔ اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو مشاعرہ ہوا اس میں مصرعہ فارسی یہ تھا ؎
زیں تماشاگاہ گریاں می رود۔ ریختہ کا مصرعہ یہ تھا۔ خمار عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے، خبر ہے کیا کہئے ــــ میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھی۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں۔ پڑھ لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھا دینا۔ بچوں کو دعا کہہ دینا۔ تمہارا دوسرا خط معہ رقعہ ملفوفہ پہنچ گیا ہے۔ والسلام والاکرام:۔ ؎

چاک از جیبم بہ داماں می رود تا چہ بر خاک از گریباں می رود

یعنی میرے جیب کا چاک دامن تک چلا گیا اب دیکھئے، گریباں کے چاک پہ کیا گزرتی ہے ؎

جوہر طبعم درخشاں ست لیک　　روزم اندر ابر پنہاں می رود

یعنی میری طبیعت کا جوہر درخشاں ہے، لیکن میرا روز ابر میں پنہاں ہو جاتا ہے یعنی میری طبیعت تو اچھی ہے مگر مقدر خراب ہے۔ ــ ے

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار　　چوں رود از دست آساں می رود

اے دل اگر کوئی کام مشکل ہو تو اس کا رنج نہ کر کیونکہ وہ مشکل ہو کر ہی آسان ہو جاتا ہے ع مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ ــ ے

جز سخن کفرے وایمانے کجاست　　خود سخن در کفر و ایماں می رود

کفر و ایماں سوائے کہنے کی باتوں کے اور کیا چیز ہیں۔ کفر و ایمان میں بھی جائے سخن باقی ہے۔ ــ ے

ہر شمیمے را مشامے درخور ست　　بوئے پیراہن بہ کنعاں می رود

ہر خوشبو کے لئے دماغ چاہئے، یعنی ایسا دماغ ہونا چاہیے جو خوشبو سونگھ سکے کیونکہ پیراہن کی خوشبو کنعاں تک پہنچ جاتی ہے:۔ ے

آید و از ذوق نشناسم کہ کیست　　تا رود پندارم آں جاں می رود

جب ان کا خیال آتا ہے تو میں ذوق کی وجہ سے یہ بھی نہیں تمیز کر سکتا کہ کس کا خیال آیا ہے اور جب وہ خیال چلا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جان چلی گئی ہے ے

مے برد اما نہ یکجا مے برد　　می رود آما پریشاں می رود

ان کا خیال صرف ایک جگہ نہیں بلکہ جگہ جگہ لے جاتا ہے اور جب جاتا ہے تو پریشان کر جاتا ہے۔ ــ ے

ہر کہ مند در رہش گوید ہے　　قبلہ آتش برستاں می رود

جو کوئی انھیں راستہ میں دیکھتا ہے کہتا ہے کہ قبلہ آتش پرستاں تشریف لئے جا رہے ہیں۔ ؎

اول ماہ است واز شرم تو ماہ   آخر شب از شبستاں می رود

چاند اوائل ماہ قمری ہیں تیری شرم سے آخر شب کو بھاگ جاتا ہے اور تمام رات تیرے مقابل نہیں رہ سکتا۔ ؎

بگزر از دشمن دلش سخت است سخت   آبروے تیر و پیکاں می رود

دشمن کو چھوڑ دے کیونکہ اس کا دل سخت سے سخت ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے تیر و پیکاں کی آبرو جاتی ہے۔ ؎

کیست تا گوید براں ایواں نشیں

آنچہ بر غالب ز درباں می رود

کوئی ہے جو اس ایوان نشیں کو بتلائے کہ غالب پر اس کے درباں کے ہاتھوں کیا گزرتی ہے۔

دیا ہے دل اگر اسکو بشر ہے، کیا کہئے   ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہئے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے   قضا سے شکوہ ہمیں کسقدر ہے، کیا کہئے

رہے ہے یوں گہہ و بیگہہ کہ کوئے دوست کو اب   اگر نہ کہئے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہئے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہمکو فریب   کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے، کیا کہئے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال   کہ یہ کہے کہ سر رہگذر ہے، کیا کہئے

تمہیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال   ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے، کیا کہئے

انھیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے ہمیں جواب سے قطع نظر ہے، کیا کہیے

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجیے ستم بہائے متاع ہنر ہے، کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے جو نا سزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقت جانکاہیٔ مرض لکھیے کہیں مصیبت ناسازیٔ دوا کہیے

کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجیے کبھی شکایت صبر گریز پا کہیے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہ ہو نگار میں الفت نہ ہو نگار تو ہے روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

خط بنام نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں صاحب شفق

قبلہ و کعبہ! وہ عنایت نامہ جس میں حضرت نے مزاج کی شکایت لکھی تھی پڑھ کر بے چین ہو گیا اور عرض کر چکا ہوں کہ مزاج کا حال

مفصل لکھئے۔ چونکہ آپ نے کچھ نہیں لکھا تو اور زیادہ متوحش ہوں
لہٰذہ رفع تشویش یعنی شفقت نامہ جلد بھیجئے۔ جناب منشی نادر حسین
خاں صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ حضرت امجد علی صاحب کا کچھ
حال معلوم نہیں۔ متوقع ہوں کہ ان دونوں صاحبوں کی خدمت
میں میرا سلام پہنچے اور آپ ان کی خیر و عافیت لکھیں۔ کبوتروں
کا نسخہ جیسا کہ میرے پاس آیا بجنسہ ارسال کرتا ہوں۔ آپ کو معلوم
ہوگا کہ میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر
لکھنؤ کے۔ نام ان کا سید حسین اور خطاب سید العلما نقش نگین میر
حسین ابن علی۔ میں نے ان کی رحلت کی ایک تاریخ پائی۔ اس میں
پانچ بڑھتے ہیں۔ یعنی ۱۲۷۸ھ ہوتے تھے تخرجہ نئی روش کا میرے
خیال میں آیا۔ میں تو جانتا ہوں اچھا ہے۔ دیکھوں آپ پسند فرماتے
ہیں یا نہیں ؎

حسین ابن علی آبروے علم و عمل	کہ سید العلما، نقش خاتمش بودے
نماد ماندے اگر بودے پنج سال دگر	غم حسین علی سال ماتمش بودے

۱۲۷۳ھ

اسی طرح ایک خط ۲۳ راپریل ۱۸۵۳ء میں غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو تحریر
کیا ہے:۔

"بھائی صاحب، بڑا تعجب ہے کہ تم اس شعر کے معنی پوچھتے ہو ؎

اول ماہ است از شرم تو ماہ آخر شب از شبستاں می رود

اول ماہ۔ یہاں بہ معنی مہینے کے ہے اور اول سے ۸، ۹، ۱۰ تاریخ
مقصود ہے اول راتوں میں بعد آدھی رات کے چاند چھپ جاتا
ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ ہنوز ابتدائے حال ہے۔ اور قمر زاید النور
ہے اور باوجود اس روز افزونی دولت کے تیری شرم سے آخر شب
کو بھاگ جاتا ہے اور تمام رات تیرے تقابل نہیں رہ سکتا اسکو
حسن تعلیل کہتے ہیں۔ یعنی چاند کا اوائل ماہ قمری میں آخر شب غروب
ہونا ضروری ہے۔ شاعر نے اس کی ایک اور وجہ قرار دی ہے۔ فقط"
غالب کے "مذاق سخن و فہم تیز" رکھنے والے شاگرد حقیر کے ایک شعر
کو اپنے خط مورخہ ۲۹ ذیقعد ۱۲۶۹ھ مطابق ستمبر ۱۸۵۳ء کو انھیں
کو تحریر کرتے وقت کس محبت سے لکھتے ہیں:۔

"بھائی صاحب یہ شعر کس کا ہے۔ ؎
بڑھ گئی تعظیم میری امتناع وصل سے۔ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھ کو اسکے دربان دیکھکر
ہاں! اور کس کا ہوگا، یا میرا یا میرے بھائی کا۔ واللہ کیا شعر ہے
یہ ایک روش خاص ہے ہر کوئی اس کو نہیں جانتا۔"

خط بنام منشی نبی بخش حقیر مورخہ دوم اکتوبر ۱۸۵۳ء۔

"بھائی صاحب۔ تمہارا خط آیا اور حال جمعیت کا معلوم ہوا۔ پھر
وہ برہمن صاحب آئے ان کی زبانی آپ کی خیر و عافیت معلوم
ہوئی۔ حق تعالیٰ تم کو مع فرزندوں کے سلامت رکھے اور مجھ کو
تمہاری ملاقات سے اور بچوں کے دیدار سے شاد کرے۔ بھائی

میں وہ قسمت لایا ہوں کہ جو چاہوں وہ نہ ہو ؎

فراماوردعا کر و اسعت گوئی   کہ از تو دور یا مدا پچہ جوئی

مکتوب بنام قاضی عبدالجلیل جنوں

"صاحب!

وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے مجھ کو پہنچا اور میں نے اس کا جواب تم کو بھیجا اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کیا لکھوں؟ یہاں ترکی تمام ہے! اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں۔ مرنا سر پر کھڑا ہے، پا بہ رکاب ہوں طرح "بالفتح بہ معنی" نمونہ "اور بہ معنی" فریب" سہی لیکن طرح بہ فتحتین اور چیز ہے۔ غیاث الدین رام پور میں ایک ملّا مکتبی تھا۔ ناقل ناعاقل، جس کا نا خدا اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا؟

؎ گیستم من کہ تا ابد بزیم۔

لا حول ولا قوۃ! یہ مصرعہ میرا نہیں۔ "تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے ؎

گیستم من کہ جاوداں باشم   چوں نظیری نماند وطالب مُرد

در بگویند: در کدامیں سال   مُرد غالب، بگو کہ "غالب مُرد"

مکتوب نگاشتہ ۲۳ جنوری ۱۸۵۸ء بنام منشی نبی بخش حقیر

" بھائی جان! تمھارا وہ خط جو شیخ رحمت اللہ صاحب کے حوالہ خط کے جواب میں تھا پہونچا تعقد ان کے حال پر مبذول رہے یہاں چیچک کا زور شور نہیں بلکہ ان دنوں میں اس کا کہیں مذکور نہیں. کول میں اطفال خورد سال کی خیر ہے۔ ذکریہ و عبدالسلام کا ہنوز آگرے میں رہنا مناسب ہے یہ ہنگامہ جہاں ہوتا ہے چند روز ہوتا ہے جب یہ وبائے خاص جاتی رہے اور ہوا صاف ہو جاوے تب آدیں۔

وہ مثنوی اور اعمال نامہ میں نے تمھارے پاس بھجوایا ہے. وجہ یہ کہ جب حضور نے حکم دیا کہ عمائد اہل سنن جو اطراف و جوانب دہلی میں ہیں ایک ایک نقل ان کو بھیجی جائے۔ میں نے دفتر میں بقید علی گڑھ کول مفتی صدرالدین خاں صاحب کا اور تمھارا نام لکھوا دیا اور کالپی میں نواب انوارالدولہ اور بریلی میں سید احمد کا نام لکھوا دیا اور کوئی ایسا سُنّی گراشنایہ میرے ہاتھ نہ آیا۔ مرزا نجف علی مرحوم تمھارے دوست ہوں گے وہ یہاں مرگئے ان کے فرزند ارجمند مرزا یوسف علی خاں کو میں اپنے فرزند کی جگہ جانتا ہوں ان کی سعادت مندیاں اور خوبیاں کیا بیان کروں کہ میں ان کا عاشق ہوں. وہ اب کول گئے ہیں تم کو لازم ہے کہ ان کے ہاں جاؤ اور فاتحہ پڑھو اور ان کا حال ان کی زبانی سنو وہ صاحبزادہ نازپروردہ گرم و سرد زمانہ نہ دیدہ ہیں۔ دو ایک

حویلیاں ان کے والد ماجد کی وہاں ہیں۔ خدا جانے وہ کیا کریں گے
آپ کو ان کی مربی گری کرنی چاہئے۔ مگر وہ پنجشنبہ کو روانہ ہونے والے
ہیں آج دوشنبہ کو یہ خط تم کو بھیجتا ہوں یقین ہے کل پہنچے گا بہ مجرد
اس کے پہونچنے کے آپ ان سے ملئے گا۔ ماتم زدہ کا بلانا مناسب
نہیں آپ کو بہ تقریب تعزیت جانا چاہئے اور یہ خط جو آپ کے نام
کا ہے ان کو پڑھا دیجئے۔

مولوی عبد اللطیف کی خدمت میں میری طرف سے یہ شعر مولانا
شرف الدین مصنف "نامۂ حق" کا پڑھ دیجئے گا۔ ؎

درطلب کردنِ حقیقت کار   از خدا شرم دار و شرم مدار"

غالب نے ایک رباعی اور ایک قطعہ "روزہ" کے باب میں
کہہ کر بادشاہ کو سنایا۔ وہ حد درجہ محظوظ ہوئے ان کا حال اپنے
ذیل کے مکتوب مورخہ ۲۸ جون ۱۸۵۳ء میں منشی نبی بخش حقیر سے
بیان کرتے ہیں۔ ـــ

"بھائی صاحب، الحمد للہ کہ اور تو سب طرح خیر و عافیت ہے
مگر گرمی کی وہ شدت ہے کہ عیاذاً باللہ۔ میں آپ احتراق کا مارا
دوسرے یہ مصیبت۔ ایک وقت کا کھانا کھانے والا۔ سو وہ اب
موقوف غذا منحصر دہی پر ہے۔ کہاں تک دہی کھاؤں، کیا کروں
اگرچہ تاب روزہ رکھنے کی کہاں مگر بر تر روزہ دار بو لے ہوں،
روزہ داروں کو کیا کہوں کیا حال ہے۔ مرے چار خدمت گزار

ہیں چاروں روزہ دار۔ آخر روز مجھ کو یوں نظر آتا ہے کہ چار مردے پھر رہے ہیں۔
یہ پریشانی اور یہ بے سرو سامانی نہ خس خانہ نہ برف آب ہے

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

افطار صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانیکو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یہ رباعی اور یہ قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا۔ بہت ہنسے اور خوش ہوئے
بھائی صاحب! میں نہ سمجھا کہ ذکیہ بیگم "عم تیسا رلون" کا سیپارہ
پڑھ چکی ہے یا حفظ کر چکی ہے اللہ اکبر۔ اگر حفظ کیا ہے تو بڑا
کام کیا ہے اور وہ بہت بڑا کام کرے اگر تیسوں پارے حفظ
کرے۔ بارے یہ تو کہو کہ تم نے تو اس کو پڑھتے سنا ہوگا حرف
شناس ہو گئی ہے اور مفردات نکال کر آپ ان کو پیوند دے
لیتی ہے یا یوں ہی طوطے کی طرح حق اللہ پاک ذات اللہ پڑھتی
ہے منشی عبد اللطیف اور ہمارے شیخ اکرام الدین اور شیخ
نصیر الدین اور کلثوم بیگم اور بی حافظہ بیگم جن کا ذکر ہو چکا ہے سب کو

دعا پہونچے اور سب بخیر و خوبی سلامت رہیں۔

دل کڑھتا ہے مرزا احسن علی بیگ رسالدار کے حال پر۔ بی بی نے ان کے پانچ چھ ہزار روپیہ نقد و جنس تباہ کر دیا۔ روپیہ کیا گویا گھر خاک میں ملا دیا۔ اب وہ غریب کیا کرے۔ میرے پاس دو تین بار آئے۔ ایک دن تنہائی میں اپنا حال کہا۔ میں دیکھتا تھا کہ اس شخص کو اب رونا آتا ہے۔ سچ ہے۔ ؎

زن بد در سرائے مرد نکو
ہم دریں عالم است دوزخ او

یہاں دلی میں ایک اصطلاح نئے نواب کی ہے اور یہ لفظ عام ہے ہندو ہو یا مسلمان اس پر صادق آجاتا ہے۔ صورت یہ کہ جہاں کوئی شخص مرا۔ بشرطیکہ دولت مند ہو، اس کا بیٹا مال پر متصرف ہوا۔ بد معاش لوگ فراہم ہوئے اور اس کو خداوند نعمت اور جناب عالی کہنا شروع کیا۔ فلانی رنڈی آپ پر مرتی ہے فلانا امیر اپنی مجلس میں آپ کی یوں تعریف کر رہا تھا۔ آپ کو لازم اس رنڈی کو بلانا اور اس امیر کی دعوت کرنی۔ دنیا اس واسطے ہے روپیہ ساتھ نہیں جاتا۔ آپ کے باوا کیا لے گئے جو آپ لے جائیں گے۔ غرض کہ بندہ آج تک تین نواب دیکھ چکا ہے۔ ایک تو کھتری تو ڈرمل لاکھ روپے کا آدمی تھا۔ پانچ سات برس میں سب کچھ کھو کر شہر سے نکل گیا اور مفقود الخبر ہو گیا۔ دوسرا

ایک پنجابی لڑکا سعادت نام۔ پچاس چالیس ہزار روپیہ کھو کر
تباہ ہو گیا۔ تیسرا خان محمد نام۔ سعد اللہ خاں کا بیٹا کہ وہ بھی
بیس پچیس ہزار روپیہ لٹا کر اور رنگبیوں پر چڑھا کر اب جوتیاں
چٹخاتا پھرتا ہے غرض کہ مردوں کو سنتے نواب بنتے سنا تھا عورتوں
میں اس نیک بخت کو دیکھا۔ اصل اس کی یہ ہے کہ ایک خانگی ہے
مکارہ اور عیارہ اب، بڑھاپے میں اس نے میرے حقیقی سالے
یعنی نواب زین العابدین خاں مرحوم کے ماموں کو دام میں لا کر
ان کے گھر بیٹھی ہے اور نیک بخت بہو بیٹیوں کو لوٹتی پھرتی ہے۔
اس نے رسالدار کی بی بی سے مل کر اس کو نیا نواب بنایا اور سارے
گھر لٹوایا۔ چنانچہ رسالدار کی زبانی آپ کو مفصل معلوم ہو گا۔ بیچارے
نے ہر چند چاہا کہ یہ میرے ساتھ چلے، ہرگز نہ گئی ؎

در کنج دماغم مطلب جائے نصیحت　　کایں حجرہ پر از زمزمۂ چنگ و رباب است

از اسد اللہ نگاشتہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء

خط بنام میر مہدی حسن مجروح

"جان غالب۔ تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے:
"ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہیں[1]
مصرعہ بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا!
اے میر مہدی تجھے[2] شرم نہیں آتی:
"میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے[3]

ارے اہل دلی یا ہندو ہیں، یا اہل حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟[2] لکھنو کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔"

بھائی صاحب۔ یہ تو آپ نے لکھا کہ تیرے وہ اشعار سنے جاتے ہیں کہ جو کبھی ہم نے نہیں سنے تھے۔ حال یہ ہے کہ میں نے ان دنوں میں دو غزلیں لکھی ہیں ایک تو دریا نہ ہوا۔ صحرا نہ ہوا۔ سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل رواں کیوں ہو اور گماں کیوں ہو۔ وہ اب بھیجتا ہوں ان دو غزلوں کے علاوہ حال میں کوئی غزل نہیں کہی۔ پس اگر اسکے سوا کوئی کچھ آپ کے سامنے پڑھے تو وہ میرا کلام نہ ہوگا۔ یا سابق کی کوئی ایسی غزل ہوگی کہ وہ آگے آپ نے نہ سنی ہوگی بندہ پرور! پندرہ روز دل کا اجر تو آپ نے مجھ کو دیا وہ فوراً میں نے الٹا پھیر دیا نہ آم ہے کہ کھاؤں نہ شربت ہے کہ پیوں۔

---

[1] نہیں لیتا ہوں خط رشک سے نام مجروح کی غزل کا پہلا مصرعہ ہے (دیوان مجروح صفحہ ۱۴۱)

[2] "ارے میر صاحب تمہیں ....

[3] اس غزل میں یہ مصرعہ نہیں ہے۔ غالب کے اعتراض پر مجروح نے اسے بدل کر شعر کو (جواب دیوان میں مقطع ہے) یوں کر دیا ہے سخن گو یوں تو اک عالم ہے مجروح۔ مرے استاد کی پر کیا زبان ہے۔

[4] "تم .... کہتے ہو۔"

بھائی اب کے تہنیت عید میں دو قصیدے کس انداز کے لکھے ہیں
کہ دیکھو گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ پرسوں یا اترسوں روانہ کروں گا
ہرگوپال صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا۔ رسالہ دار کے گھر کے باب
میں جو کچھ تم نے کہا وہ مطابق واقعہ نہیں ہے یعنی اس نیک بخت
نے ضد سے یہ کام نہیں کیا: ع این حکایت را بیانے دیگر است
ایک زن مرد افگن بدروش بدفن نے اس کو لوٹا کھایا۔ مہانداری
ہرروزہ دگل و میوہ و نقش و نگار۔ رنگ و بو۔ یہ عیاشی و بدمعاشی
ہے۔ نہ آزردگی و دل آزاری ۔۔۔۔۔۔۔ ۵

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو۔ نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو۔ نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا۔ تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم۔ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ۔ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے۔ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے۔ ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں۔ عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی۔ بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب۔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس مکتوب کے ہمراہ غزل مندرجہ بالا منشی نبی بخش حقیر کو بھیجی گئی ساتھ ہی وہ قطعہ انتظار صوم ـــــ "لا اسی کے ذیل میں درج ہے جسے یہاں حذف کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس سے قبل کے صفحات میں اس کا تذکرہ رباعی کے ہمراہ آچکا ہے۔ اب ایک خط جولائی ۱۸۵۵ء کا ملاحظہ ہو:۔

"بھائی صاحب، قصیدہ مدحیہ حضرت ولی عہد بہادر میں شین کی ضمیر مطلع سے لے کر بطرف معشوق کے راجع ہے:۔ ؎

زہے بتانِ مغاں شیوہ دادخواہانش   زدست ہائے حنا بستہ گل بدامانش

زہے کا مورد مذکور نہیں۔ یعنی معشوق۔ شاعر کہتا ہے واہ عجب معشوق ہے کہ بتانِ مغاں شیوہ دادخواہ اس کے ہیں۔ مغاں شیوہ صفت ہے بتاں کی۔ مرے معشوق کے دادخواہ ہیں ایسے معشوق کہ جو مغاں شیوہ ہیں اور مغوں کی جہاں اور روشیں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہاتھوں میں مہندی لگائے رہتے ہیں اور معشوقوں کے ہاتھ بھی حنائی ہوتے ہیں اور دادخواہ کا کام دامن پکڑنا ہے جب معشوق اس کے دامن گیر ہوئے اور ہاتھ ان کے حنائی ہیں تو گویا وہ دست ہائے رنگین پھول ہیں اس کے دامن میں۔ الحاصل اس بیت کے سبب سے زہر بدل جا گزیدہ بیکانش۔ شین کی ضمیر بطرف معشوق راجع ہے باقی اور اشعار میں اور طرف ہے کہ قرینہ اس پر دال ہے۔

تم کس ریختے کو نیا سمجھتے ہو۔ کہاں گئے اور ہوا کئے"

(غالب نے جس ردیف و قافیہ پر مبنی غزل کا تذکرہ کیا ہے وہ غزل یہ

جس کا مطلع ہے۔ اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے۔ بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے۔ یہ غزل نو اشعار پر مشتمل ہے۔ مقطع ہے۔ غالب تمھیں کہو کہ ملیگا جواب کیا؟ مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے۔ اس حساب سے یہ غزل ۱۸۵۲ء میں کہی گئی تھی)

یہ غزل پرانی ہے۔ دریا مرے آگے، صحرا مرے آگے، اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے۔ قلعہ مبارک کے مشاعرہ کی غزل ہے: ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے آگے ۔ اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور ۔ جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے ۔ گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ۔ تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں ۔ بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار ۔ رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا ۔ کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر ۔ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام ۔ مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے ۔ آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو ۔ آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اس خط کے نیچے جولائی ۱۸۵۴ء درج ہے مگر متن کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ غزل کبھی ۱۸۵۳ء میں کہی گئی تھی۔

مکتوب بنام قاضی عبدالجلیل جنونی

حضرت! کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آگے اس سے جو آپ کے اشعار آئے تھے، وہ دو دن کے بعد اصلاح دے کر بھیج دیے۔ خط ڈاک میں تلف ہو جائے تو میرا کیا گناہ؟ آج آپ کا یہ صبح کو خط آیا۔ میں نے آج ہی دوپہر کو دیکھ کر لفافہ کر کر ڈاک میں بھجوا دیا۔ اب پہونچے، نہ پہنچے۔ دو باتیں سنئے: "طرح" بہ سکون رائے قرشت بہ معنی "فریب" ہے لیکن اردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں۔ وہ دوسرا لغت ہے "طرح" بہ حرکت رائے قرشت بر وزن "فرح" اور اس کو بہ سکون رائے (مہملہ) بولنا عوام کا منطق ہے۔ معاذ اللہ اگر تقریر میں اس طرح بہ سکون بولوں تو (زبان اپنی) کاٹ ڈالوں۔ چہ جائے آں کہ نظم میں لاؤں! ہاں "غزل کی طرح" (ر۔ ح۔ ک۔ یہ بہ سکون ہے اور ر) بہ معنی "روش" و "طرز" "طرح" ہے بہ فتحتین

(داستان . . . .) "افسانہ" نہیں "دستان" کے تین معنی۔ ایک تو رستم (کے باپ (کا نام اور وہ) علَم (ہے دوسرے . . . تیسرے) آواز خوش . . . . . اور یہ جو بلبل کو "ہزار داستان" کہتے ہیں۔ سو تی اور

فرمایا (لوگ کہتے) ہیں۔ صحیح "ہزار دستان" ہے یعنی بہت طرح کی آوازیں بولتا ہے۔

جناب مولوی احمد حسن صاحب عرشی کو میرا سلام پہنچے۔ یکشنبہ ۲۸ر اگست ۱۸۵۹ء؁

غالبؔ، حقیر کو ایک مکتوب ۸ر مارچ ۱۸۵۵ء؁ میں۔ رقمطراز ہیں:-

"بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہونچا میرا خط نہ لکھنا تغافل و تساہل سے نہ تھا آپ اپنے دورے کا جانا لکھ چکے تھے میں چاہتا تھا کہ جب آپ علی گڑھ آلیں اور مجھ کو اطلاع دیں تو میں خط لکھوں۔ حافظہ بیگم کو دعا پہونچے حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست رکھے اور تیسوں سپارے حفظ کرنے کی توفیق دے۔"

۱؎ عود میں یہ خط ناقص ہے۔ اصل خط کا کاغذ بوسیدہ ہو کچھ لفظ غائب ہیں۔ کچھ پڑھے نہیں جاتے۔ دوسرے رخ پہ جنوں کے قلم سے لکھے ہوئے پانچ اخیر شعر ایک فارسی غزل کے اس کے بعد تین غزلیں اردو کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ورقے کا پہلا ورق ضائع ہو گیا پانچ فارسی شعروں میں سے بہت کچھ ضائع ہو چکا ہو مگر غالب نے خود ایک شعر عطا فرمایا ہے "نالۂ بلبل کجا باشد چنیں؟ ہمی چکد خون دل از دستان من۔ اور اس اردو شعر کو قلم زد کر دیا ہے "یاں بھی چھوڑا انہیں ہم کو شب تنہائی نے۔ پہلوے گور سے کس طرح کنارا کیجئے"

(خطوط غالب، مرتبہ مالک رام صفحہ ۱۸۲)

منشی عبداللطیف کا حال معلوم ہوا خدا پر نظر رکھو اور تقویت کی رعایت کیے جاؤ لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ جدوار بہت مفید ہوگی اگر وہاں اچھی نہ ملے تو مجھ کو لکھ بھیجو میں یہاں سے بھیج دوں۔ نیمروز تمھارے پاس ہے اب اور کیا کروگے۔ اگر ایسی ضرورت ہے تو لکھ بھیجو میں دو تین جلد اور بھیج دوں ان دنوں میں دو رباعیاں اردو میں کہی ہیں ان کو بہ نظر اصلاح دیکھو۔

رباعی

کہتے ہیں کہ وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہات کے ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ ہوئے سلام کرنے والے	کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ	وہ آپ ہیں صبح شام کرنے والے

مکتوب بنام منشی نبی بخش حقیر مورخہ ۲ جون ۱۸۵۵ء ملاحظہ ہو:۔

"لو صاحب" اور تماشا سنو۔ آپ مجھ کو سمجھاتے ہیں کہ تفتہ کو آزردہ نہ کرو میں تو ان کے خفا کے نہ آنے سے ڈر اتھا کہ کہیں مجھ سے آزردہ نہ ہوں۔ بارے جب تم کو لکھا اور تم نے بہ آئین مناسب ان کو اطلاع دی تو انھوں نے مجھ کو خط لکھا چنانچہ پرسوں میں نے اس خط کا جواب لکھ بھیج دیا تمھاری عنایت سے وہ جو ایک اندیشہ تھا

رفع ہو گیا خاطر میری جمع ہو گئی، اب کون سا قصہ باقی رہا کہ جس کے واسطے آپ ان کی سفارش کرتے ہیں۔ واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے رہا دیباچہ۔ تم کو میری خبر ہی نہیں ہے، میں اپنی جان سے مرتا ہوں:۔ ع

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں اور مجھ کو معاف رکھیں خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کر دگے؟

بھائی جان! منشی عبداللطیف کی شادی پہلے اس پر پھر اس کے بھائیوں اور بہنوں پر مبارک ہو۔ پھر کہتا ہوں کہ خدا کرے یہ امر اس کی خوشی اور رضامندی سے واقع ہوا ہو۔ ذکیہ بیگم کی نسبت مبارک ہو۔ ہوا خوب ہو گئی ہے مینہ روز برستا ہے۔ یکم جولائی سے آج تک جھڑی کی صورت ہے یقین ہے کہ وہاں بھی یہی موسم ہو گیا ہو گا ع

نہ کشت و زرع شناسیم و نے حدیقہ و باغ۔ ز بہر بادہ طلبگار باد و بارانیم

اب کے آپ کا خط بہت انتظار کے بعد آیا۔ کئی دن سے چاہتا تھا کہ شکایت لکھوں مینہ فرصت نہیں دیتا تھا کہ آدمی ڈاک گھر جا سکے بارے پرسوں آپ کا خط آیا کل مینہ برسا رہا آج کچھ کھل گیا ہے

یعنی بارش نہیں ہے قلعہ بھی گیا اور تم کو بھی خط لکھا۔ والسلام والاکرام از اسد اللہ پنجم جولائی ۱۸۵۵ء۔ خط مورخہ ۱۱ ر ذیقعد ۱۲۷۱ھ مطابق پنجشنبہ ۲۶ ر جولائی ۱۸۵۵ء بنام حقیر

بھائی صاحب! مینہ کا یہ عالم ہے کہ جدھر دیکھیے ادھر دریا ہے آفتاب کا نظر آنا برق کا چمکنا ہے یعنی گاہے دکھائی دے جاتا ہے۔ شہر میں مکان بہت گرتے ہیں اس وقت بھی مینہ برس رہا ہے خط لکھتا ہوں ہوں مگر دیکھیے ڈاک گھر کب جاوے۔ کہار کو کمل اڑھا کر بھیج دوں گا

آم اب کے سال ایسے تباہ ہیں کہ اگر بہ مثل کوئی شخص درخت پر چڑھے اور ٹہنی سے توڑ کر دہیں بیٹھ کر کھائے تو بھی سڑا اور گلا ہوا پائے۔

یہ تو سب کچھ ہے مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے۔ تمبر سنگھ اس کا لاڈلا بیٹا مرگیا ہائے اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ع

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را۔
چہ کند گوئی کہ تن در ندہد چوگاں را۔

تم اب خط لکھنے میں بہت دیر کرتے ہو۔ آٹھویں دن اگر ایک خط لکھتے رہو تو ایسا کیا مشکل ہے۔

یہاں دونوں لڑکے اچھی طرح ہیں۔ آپ وہاں کے لڑکوں کی خیر و عافیت لکھیے!

اسد

۱ ایک مختصر سے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو ۱۴ ر محرم ۱۲۷۲ھ مطابق یکشنبہ

۱۶ ستمبر ۱۸۵۵ء لکھتے ہیں :-

"ہم نے تمھارے اشعار ایک تذکرے میں دیکھے اور جانا کہ تم چھپے رستم ہو اپنے شعر ہم سے اس لئے چھپائے ہوں گے کہ یہ مضمون چرا نہ لے۔"

حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ جب سے حقیر کی غالب سے شناسائی ہوئی انھیں ان سے تلمذ ہو گیا اور جیسا کہ غالب نے اپنی نگارشات میں جگہ بہ جگہ بڑی عقیدت و محبت سے ان کا تذکرہ کیا ہے وہ غالب کے ان شاگردوں میں سے تھے جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی پر انھوں نے بجا ناز کیا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر ولد منشی حسین بخش اکبر آبادی محلہ تاج گنج آگرہ کے رہنے والے تھے بہ مقام کول علی گڑھ میں سررشتہ دار کے عہدہ پہ فائز تھے۔ غالب سے پہلے انھیں میر گلزار علی اسیر پسر ولی محمد نظیر اکبر آبادی متوفی ۱۸۳۰ء سے شرف تلمذ تھا غالباً حقیر تخلص بہ مناسبت اسیر اسی وجہ سے قرار پایا ہو۔ بعض تذکرہ نگاروں نے حقیر کو میر گلزار علی اسیر کا شاگرد لکھا ہے اور یہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک خط مرقومہ ہر جون ۱۸۴۳ء سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حقیر نے تاریخ مذکورہ یا اس سے کچھ قبل غالب سے اصلاح لینی شروع کر دی تھی کیونکہ وہ حقیر کو لکھتے ہیں :-

رباعیاں آپ کی بھیجی ہوئی میرے پاس موجود ہیں بعد اصلاح کے

آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ گھبرائیے نہیں اور خاطر جمع رکھیے۔

دوسرے خط مورخہ ۲۷ر اکتوبر ۱۸۵۲ء میں رقم طراز ہیں :۔

"اگلی غزل پہلے تو میاں محمد حسین[1] دہلوی لائے اور پھر آپ نے خط میں بھیجی ایک شعر اس میں میرے انداز کا تھا وہ میں نے آپ کو لکھ بھیجا تھا باقی اور اشعار سب اچھے اور بے عیب اور ہموار اگر جگہ اصلاح کی ہوتی تو میں کبھی چشم پوشی نہ کرتا تم سے میرا یہ معاملہ نہیں ہے کہ خوشامد کروں تمھارا کلام میرا کلام تمھارا ہنر میرا ہنر، تمھارا نقص میرا نقص اب دیکھو اس غزل میں ایک شعر موقوف کر دیا گیا اور مطلع میں اور ایک بیت میں تغیر الفاظ ہو گیا۔ جن شعروں پر صاد ہے وہ بہت خوب ہیں واہ واہ سبحان اللہ اور جن پر صاد نہیں ہے۔ وہ خوب ہیں"

اوپر دیے گئے دونوں خطوط کے اندراجات میں کتنا تفاوت ہے۔ پہلے خط میں تکلف کارفرما ہے تو دوسرے خط میں بے تکلفی، محبت اور یگانگت رچی بسی ہے اس چھ سال کے عرصہ میں وہ غالب کو اور غالب حقیر کو اچھی طرح پرکھ چکے تھے کیونکہ غالب کو سب تک حقیر نہیں ملے۔ تھے انھیں اپنے کلام پر حسب دل خواہ داد نہ ملنے کی ہمیشہ شکایت رہا کرتی تھی انھوں نے اس کا تذکرہ کئی جگہ کیا ہے کبھی نظم کبھی بذریعہ نثر۔ اسی کسمپرسی کو وہ اپنی بے کسی و تنہائی پر محمول کیا کرتے

---

[1] یہ محمد حسین دہلوی وہی بزرگ ہیں جو بعد میں شمس العلماء کے لقب سے ملقب ہوئے اور آزاد تخلص کیا۔ مؤلف آب حیات

کھئے گو کہ غالب کے کرم فرماؤں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد صدرالصدور
مولوی صدرالدین آزردہ جیسا صاحب فضل و کمال اور غیر معمولی جامعیت کا بزرگ اور
مولوی فضل حق خیرآبادی جیسی علوم دینیہ پر تبحر رکھنے والی شخصیت تھیں مگر انکی آزادہ روی
کی بنا پر ان حضرات سے انکی خاطر خواہ نبھ نہ سکی۔ آخر ش انھیں حقیر جیسا سخن طراز و سخن فہم مل گیا جو
انکی افتاد طبع سے ہر طرح مطابقت رکھتا تھا۔ ایک جگہ وہ حقیر سے یوں مخاطب ہیں :۔

"کیسی تاریخ اور کیسی نقل میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو نظم و نثر تمھاری نظر
سے نہ گذرے وہ ضایع ہے :۔

وائے بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نہ رسد"

غالب کو اپنے ہونہار شاگرد سے جسے وہ بھائی، بھائی جان، بھائی صاحب
جناب عالی، پیرو مرشد اور خدا جانے کن کن عقیدت کیشانہ عنوانات سے مخاطب
کیا کرتے تھے، دل کھول کر داد ملتی تھی اور وہ اپنے کلام کی داد دیا نے پر انکساری
کا کچھ اس طرح اظہار کیا کرتے تھے :۔

"تم غزل کی تعریف کرتے ہو میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کا ہے کو ہیں
پیٹ پالنے کی باتیں ہیں، سو یہی روٹیاں، یہی دال سالن"

ہیرے کی قدر و منزلت کچھ جوہری کی نظر میں ہوتی ہے غالب کی نظروں
میں جو قدر و منزلت حقیر کی تھی اس بنا پر جب وہ غالب سے جب کسی شعر کے
مفہوم میں تامل ہوتا بلا تکلف استفسار کر لیتے اور غالب متحیر ہو کر سوال کر بیٹھتے
"بھائی بڑا تعجب ہوتا ہے۔ تم اس شعر کے معنی پوچھتے ہو" حقیر کے
اسلاف گو پنجاب کے رہنے والے تھے مگر بعد میں نقل مکان کر کے

دلی بعد میں آگرہ چلے آئے ان کے والد شیخ حسین بخش اکبرآباد ہی میں
تولد ہوئے وہ بھی شاعر تھے پہلے تخلص بخشی کرتے تھے پھر بدل کر
عاصی کر لیا تھا۔ میاں نظیر کے شاگرد تھے۔ اکبرآباد میں محلہ تاج
گنج میں سکونت پذیر تھے۔ حقیر انگریزی عدالت فوجداری میں
سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز تھے اور اس علاقہ سے عرصۂ دراز
تک بہ مقام کول ضلع علی گڑھ میں مقیم رہے۔ اکتوبر یا نومبر
۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔

منشی نبی بخش حقیر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی
کرتے تھے لیکن مختلف مقامات سے کاوش کے بعد بھی صرف اسقدر
کلام دستیاب ہو سکا جو درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ان کا پہلا شعر
اس سے قبل دیا جا چکا ہے۔ متفرق کلام کے ساتھ دوبارہ درج کیا
گیا ہے ؎

بڑھ گئی تو تیری امتناع دخل کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھکو اسکے دربان دیکھکر
کیا سبک رو ہیں رہ روان عدم کہ کسی کا نہ نقش پا دیکھا

شانے نے بل نکال دیے زلف یار کے سیدھا کیا ہے موذیوں کو مار مار کے

مجھ خفتہ بخت کا جو سنا ذکر سو گئے احوال غم میں خواب کا افسانہ بن گیا

مجھ میں اور قیس میں ہے فرق حقیر — وہ مقید ہے اور میں وارستہ

سنتے ہیں گئے مانی و بہزاد عدم کو — اب کھینچیں تو کھینچیں کمر یار کی تصویر

لاغر ہے قیس، پر نہ حقیر اسقدر کہ میں — ہے کاہ کوہ آگے مرے جسم زار کے

عین نورِ نظرِ گبر و مسلماں ہو تم — چشم بد دور بت و قدرت یزداں ہو تم

گر تو نہیں ہے عاشق پھر یہ حقیر ہر دم — کیوں نالہ حزیں ہے کیوں کوہ آتشیں ہے

پھر جنوں آگے ہوا دست و گریباں ہم سے — نہ گریباں ہی بچے اب کے نہ داماں ہم سے

دیر میں ہے ذکر اپنا کعبے میں بیاں اپنا — ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا

ہم تو چھوڑینگے نہ اسکے رخ کا کاکل کا خیال۔ کوئی کافر کہے یا کوئی مسلماں ہم سے

وہ نگاہیں جنسے تھی مجھ کو تسلی کی امید — تشنۂ خوں آفتِ دل دشمنِ جاں ہو گئیں

آتشِ دل نے تو سرتا بہ قدم پھونک دیا — دیکھیں اب کرتے ہیں کیا دیدہ گریاں ہم سے
کشمکش ہم سے شبِ ہجر کی مت پوچھ حقیر — ہجر سے تنگ ہیں ہم آتنگ ہے ہجراں ہم سے

ہاتھ دوڑائے جنوں نے سپر گریباں دیکھکر — پاؤں پھر وحشت نے پھیلائے بیاباں دیکھکر

گر یہی چاک کی عادت ہے تو لے دستِ جنوں — پیرہن سارے گریباں ہی گریباں ہونگے
قتل تم ہنس کے کروگے تو مریں گے لاکھوں — کشتہ ہر کشتہ کے ہمراہ صد ارماں ہونگے

سو، اتفاق، حقیر کی بحرِ خفیف میں ایک غزل سات بیتوں پر مشتمل دستیاب ہو گئی جو درج ذیل کی جاتی ہے :-

سایۂ قصر ترا یاد آیا — پھر ہمیں ظلِ ہما یاد آیا
یدِ بیضا کا جو منہ کو دیکھا — ان کا نقشِ کفِ پا یاد آیا
زخم کے منہ میں بھر آیا پانی — جبکہ پیکاں کا مزا یاد آیا
پھر گریباں کے اڑیں گے پرزے — پھر وہی چاک قبا یاد آیا
خط جو غیروں کو کیے اس نے رقم — ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا
بسکہ مصنوع ہے صانع کی صفت — بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا

آج پھر اس بتِ کافر نے حقیر
وہ ادا کی کہ خدا یاد آیا

اب فاسی کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

زخونفشانیٔ چشم، ترا بجوں، بگریند — کہ ہم زِ دست مرا اکنوں درد دل افتاد دست

در گلستان گذرش نزاں افتد | کہ گل از چشم گلستاں افتد
افتد آں سر کہ درو ساماں است | سر ہماں بہ کہ زساماں افتد
خوں شد و کارِ دل افتاد بہ اشک | اشک را کار بداماں افتد

برمحل نہیں، تو کچھ بے محل بھی نہیں اگر حقیر کے پہلے استاد اسیر کا تھوڑا سا کلام نمونتاً دے دیا جائے کیونکہ آخرش غالب سے حقیر اور ان سے اسیر کا جو ربط ہے وہ استادی شاگردی کے پیش نظر پرتوِ کلام پر بھی کچھ تا، ثرات چھوڑتا ہی ہے۔ ویسے خلیفہ میر گلزار علی اسیر' میاں ولی محمد نظیر اکبرآبادی کے خلف اکبر ہونے کی وجہ سے اپنے عہد کے بڑے نامور شعرا میں شمار کیے جاتے تھے وہ بہ مقام تاج گنج اکبرآباد ۱۸۰۲ء مطابق ۱۲۱۶ھ میں پیدا ہوئے علوم رسمیہ کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ابتدا میں مہاراجہ بلونت سنگھ والئی بنارس کی سرکار میں ملازم رہے۔ وہاں سے ریاست دھول پور چلے گئے جہاں انھیں پانچ روپے یومیہ ملتا تھا۔ دوران قیام دھولپور تاریخ اردو منظوم لکھی۔ مطبوعہ دیوان اردو اور ایک مثنوی "سوزِ عشق" یادگار چھوڑی۔ ۱۸۷۹ء مطابق ۱۲۹۶ھ انتقال کیا۔ ان کے ایک شاگرد غلام محمد رہا نے "حیھ" کے تخرجہ سے تاریخ نکالی جو ان کی قبر کے طاق میں کندہ ہے ؂

"گفت اسیر دام ہستی شد رہا"

آگرہ کے اکثر شعرا ان سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے صاحبزادے میاں نثار علی بھی شاعر تھے اور پذیر تخلص کرتے تھے ملاحظہ ہوں اسیر کے چند اشعار

روح سے مصرع ملا تب تالب انسان کا کیا ہی برجستہ ہوا مطلع مرے دیوان کا

ہم کہاں، ساقی کہاں ساغر اسیر یہ بھی تیری ناز کا سنجوگ ہے

جو لوگ ہنستے ہیں عاشق کے خون رونے پر الٰہی ان کو بھی دردِ جگر دیا ہوتا

چلو بھر پانی میں ہے ڈوبتا غیرت والا بے حیا گالیاں کھاتا ہے کھڑا دریا میں

لختِ جگر کے پھول لٹا کر بہار میں کنج قفس اسیرؔ پھلتی بنائیں گے

بارہ برس جو خدمت مرشد کی کی اسیر تب پھاڑ دے کا نام سنا گل صفا پھر

شادی کے گل کھلے کہیں غم کے ثمر لگے فی الواقعی یہ گلشن گیتی دو رنگ ہے

مال رہ جائے کسی پاس نہ دولت رہ جائے یہ بڑی چیز ہے دنیا میں جو عزت رہ جائے

واعظ کی لاکھ دفعہ اڑائی ہیں دھجیاں سو بار لٹتے زاہد مکار کے لئے

ایک مکتوب مورخہ ۳ر اکتوبر ۱۸۵۵ء میں حقیر سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:-
"بھائی۔ تمہارا غصہ میرے سر آنکھوں پر۔ واللہ یہ نہیں ہے، جو تم

سمجھتے ہو، البتہ یہ خیال تو مجھ کو آیا کہ دیکھو بھائی کو میرے کلام سے انس نہیں ہے ورنہ ایسی چیز کو ہاتھ سے نہ دیتے نہ یہ کہ اس کا دینا باعث اس کا ہوا ہو کہ اور نسخہ تم کو نہ بھیجوں۔ چھاپے خانے والوں نے سوداگروں کے ہاتھ بہ طریق پیشگی سو سو۔ دو دو سو مجلد بیچ ڈالے تھے چھاپہ خانے سے جو میں نے منگایا تو مجھ کو نہ ملا۔ اب متفرق کتاب فروشوں سے کہہ دیا ہے۔ کوئی نسخہ ہاتھ آیا اور میں نے بھیجا۔ میرا تو یہ حال ہے جو کچھ میں نے کہا پھر جب تک تمہارے پاس نہ بھیج لوں مجھ کو چین نہیں آتا تم کو سخن فہم جانتا ہوں۔ رات کو ایک غزل کئی برس کے بعد لکھی ہے اب صبح دم تم کو لکھتا ہوں۔ خدا کے واسطے غور کرنا کہ غزل اس کو کہتے ہیں۔

عید کی مثنوی صرف روپے بچانے کی تھی۔ یعنی اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ کو چار روپے نذر دینے پڑتے۔ جب مسودوں میں نہ رکھوں اور دیوان میں نہ لکھوں تو حضرت کو کیوں نہ بھیجوں!

پلنگ کے پائے ڈھونڈھ رہا ہوں۔ خاطر عاطر اس طرف سے جمع رہے۔ لو غزل سنو، مگر غور سے دل لگا کر۔ اس کی نقل جہاں چاہو وہاں بھیجو ۔

۱ اے ذوق نوا سنجی بازم بخروش آور — غوغائے شبیخونے بر بنگہ ہوش آور

۲ گر خود نہ جہد از سر از دیدہ فرو بارم — دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

۳ ہاں ہمدم فرزانہ دانی رہ ویرانہ — شمع کہ نخواہد شد از باد خموش آور

۴ شورابۂ ایں وادی تلخست اگر راوی — از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

۵ دانم کہ زرے داری ہر جا گزرے داری — مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور

۶ گر مغ بکدو ریزد بر کف نہ و راہی شو — ور شہ بسبو بخشد بردار و بدوش آور

۷ ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل — آں در رہ چشم افگن ایں از پئے گوش آور

۸ گاہے بسکندستی از بادہ رخو لیشم بر — گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

۹ غالب کہ بقایش باد ہم پائے تو گر ناید
بارے غزلے فردے زاں موزیہ پوش آور

(ترجمہ)

۱۔ اے ذوقِ نوا سنجی مجھے پھر آمادہ شورش کر۔ اور میرے ہوش پر شب خون مار

۲۔ اگر خون سرے خود بخود نہیں نکلتا تو اسے آنکھوں کے راستہ سے زمین پر برسادے۔ دل کو خون کر اور اس خون کو اپنے سینے میں جوش زن کر۔

۳ اے عقلمند دوست تو بیاباں کا راستہ جانتا ہے۔ ایسی شمع لا جو ہوا سے نہ بجھ سکتی ہو۔

۴ اس وادی کے کھاری پانی کا چشمہ بہت تلخ ہے۔ اگر تو دلیر اور سخی ہے تو شہر سے میری جانب چشمۂ شیریں لا۔

۵ میں جانتا ہوں کہ تیرے پاس روپیہ پیسہ ہے اور تیرا ہر جگہ گذر ہے۔ اگر سلطان تجھے شراب نہ دے تو کلال کی دوکان سے لے آ۔

۶ مغ جس کی تحویل میں شراب رہتی ہے۔ اگر تیرے تونبے میں شراب ڈالدے تو اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر راستہ لے یعنی اس کے ہاتھ پر رکھ کر چلا آ۔ اور اگر

بادشاہ تجھے ایک سبو بخش دے تو اسے کندھے پر اٹھا کر لے آ۔

۷ ریحان، مینا سے اگتی ہے اور نغمہ قلقل سے ٹپکتا ہے۔ ریحان کو آنکھ کی راہ میں ڈال دے اور اسے کان کے لئے لے آ۔

۸ کبھی جلد اس شراب کی تاثیر کی وجہ سے مجھے بے خود بنا دے اور کبھی اس بیہ مستی کی حالت میں نغمہ سنا کر مجھے ہوش میں لا۔

۹۔ غالب خدا اس کو جیتا رکھے اگر تیرے ساتھ نہ آسکے تو خیر
اس کمبل پوش درویش سے کوئی غزل یا کوئی شعر ہی لے آ

مذکورہ بالا فارسی غزل غالب نے نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو بھی ارسال کی تھی جیسا کہ درج ذیل مکتوب سے مترشح ہے:۔

"شب کو ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اسی وقت سے خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر واجد علی صاحب کو سنا دیں۔ اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں صاحب اور ان کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے"

مکتوب بنام تفتہ:۔

"بھائی صاحب! کئی خط اس عرصہ سے تم کو لکھے مگر جو لکھنا تھا وہ بھول گیا۔ پلنگ کے پائے مسلّم۔ لیکن یہ تم نے نہیں لکھا کہ پائے بڑے پلنگ کے ہوں یا چھوٹی سی پلنگڑی کے ہوں۔ مقدار مالیت

بادشاہ تجھے ایک سبو بخش دے تو اسے کندھے پر اٹھا کر لے آ۔

۷ ریحاں، مینا سے اُگتی ہے اور نغمہ قلقل سے ٹپکتا ہے۔ ریحاں کو آنکھ کی راہ میں ڈال دے اور اسے کان کے لئے لے آ۔

۸ کبھی جلد اس شراب کی تاثیر کی وجہ سے مجھے بے خود بنا دے اور کبھی اس بیہ مستی کی حالت میں نغمہ سنا کر مجھے ہوش میں لا۔

۹۔ غالب خدا اس کو جیتا رکھے اگر تیرے ساتھ نہ آسکے تو خیر
اس کمبل پوش درویش سے کوئی غزل یا کوئی شعر ہی لے آ

مذکورۂ بالا فارسی غزل غالب نے نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو بھی ارسال کی تھی جیسا کہ درج ذیل مکتوب سے مترشح ہے:۔

"شب کو ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اسی وقت سے خیال میں تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں، اور میرے قبلہ جناب میر واجد علی صاحب کو سنا دیں۔ اور میرے شفیق منشی نادر حسین خاں صاحب اور ان کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے۔"

مکتوب بنام تفتہ:۔

"بھائی صاحب! کئی خط اس عرصہ سے تم کو لکھے مگر جو لکھنا تھا وہ بھول گیا۔ پلنگ کے پائے مسلّم۔ لیکن یہ تم نے نہیں لکھا کہ پائے بڑے پلنگ کے ہوں یا چھوٹی سی پلنگڑی کے ہوں۔ مقدار مالیت

تو معلوم مگر اندازہ پستی و بلندی کا نہیں معلوم۔ اس کا لکھنا ضرور ہے ضرور لکھو اور جلد لکھو۔

بھائی، کل مرزا تفتہ کا خط آیا انھوں نے کچھ قطعہ اصلاح کے بھیجے ہیں۔ از انجملہ دو قطعہ تمھاری مدح اور اظہار محبت میں ہیں۔ ایک مجھکو پسند آیا وہ تم کو لکھتا ہوں ؎

لہ دگر کہ گریہ کند سر بہ مرگ ما زینساں
دگر کہ از لبش اینگونہ ہائی و ہو بچکد

بود حقیر بہ فن محبت آں یکتا
کہ خوں شود دل ما ز چشم او بچکد

چوتھے مصرع میں کیا خیال نازک ہے۔ خدا اس عزیز کو جیتا رکھے اور اس کے حال پر رحم کرے۔ اسد، نہم اکتوبر ۱۸۵۵ء

ذیل کا خط بھی منجانب غالب، منشی حقیر کو چار شنبہ ۲۰ ماہ اگست ۱۸۵۶ء تحریر کیا گیا:۔

"بھائی صاحب! خط نہ پہونچنے کی شکایت کیا معنی۔ شنبہ سے جمعہ تک کو ہفتہ گنتا ہوں۔ سو اس ہفتہ میں خط بھیج چکا۔ اب کے ہفتہ میں

لہ اور کون ہے جو ہماری محبت پر اس طرح سے رونا شروع کرے اور اسکے لبوں سے اس طرح آہ و زاری جاری ہو۔ اس فن محبت میں حقیر یکتا ہے کہ ہمارا دل خون ہو کر اس کی آنکھ سے ٹپک پڑتا ہے۔

میں جمعہ تک مجھ کو اختیار ہے۔ کل منگل کو آپ کا خط آ گیا۔ بعینہ یہاں بھی وہی حال ہے جو وہاں ہے۔ وبا کم اور مینھ بہت۔ کل سے صورت آفتاب کی نظر آنے لگی وہ اس طرح ؂

دیدار مے نمائی و پرہیز مے کنی

نظر آیا اور چھپ گیا۔

تپ کی بڑی شدت ہے۔ دونوں لڑکوں کو تپ آتی ہے۔ بڑے کو اتوار سے کہ آج بدھ چوتھا دن ہے۔ چھوٹے کو پیر سے کہ آج تیسرا دن ہے۔ مغلانی متوفیہ کی جگہ جو مغلانی رکھی گئی تھی وہ تپ زدہ ہو کر سراسیمہ اپنے گھر گئی۔ میرا ایک خدمت گار غلام حسین نام تپ میں بے خود پڑا ہے۔

منشی عبد اللطیف کا یہاں ہونا سن کر جی خوش ہوا۔ میری دعا کہنا اب تو میرٹھ میں بھی وہ شدت نہیں ہے۔

ذکیہ بیگم کو دعا کہنا اور میری طرف سے اور اس کی چچی یعنی میری بی بی کی طرف سے پیار کرنا۔ میاں نصیر الدین کو دعا پہونچے۔ باقی خیر و عافیت۔ غالب۔

غالب کا ایک فارسی شعر، فارسی مکتوب بمعہ ترجمہ شعر و خط ملاحظہ ہو۔ ؂

گفتی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت   مے تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند داشت

اندیشہ گواہ است و مشاہدہ شاہد کہ کاستن از بہر آراستن است و زدودن از برائے نمودن۔ سر درا چوں بیارایند بہ پیرایند و باد

را تا بہ پیمانہ پیالائیدنی پارہ تا بریدنی پارہ ازاں نجردگی فرود۔ صورت
قلم نتواں داد و کاغذ را تا بریدن لخت لخت نشود نامہ نام نتواں
نہاد۔ آرے در کارگاہ کون و فساد ہیچ بے کون و ہیچ کون بے فساد
نیست۔ از عالم آفریدہ اند و بہ سپہر بردند و چندے ہم بداں پایہ نگاہ
داشتند و سپس بر زمین زدند تا پیکرم چناں بہ خاک نقش بست آں کہ
آں نقش بہ ہیچ کرنلک از خاک نتواں سترد۔ گوئی دریں۔ کون و فساد
کہ ناگاہ رو دیداد مرا بردند خستہ را بجائے من آوردند کہ مرگ از زیستی د
خندہ از گریستن نشناسد۔ یارب ایں پیکر کہ بہ خاک نقش بست و ایں
نقش کہ ازاں پیکر بہ خاک نشست زدودہ باشد کہ از روئے خاک
تہ خاک سپرند۔ دریں روزگار کہ از بند ستم رستگار و بہ بند غم
گرفتارم۔ سخنور جادو بیاں از خود رفتہ منشی ہرگوپال تفتہ را بہ
سرم گذار افتاد۔ شنیدم کہ آں لطف گستر کہ بہ دہلی رفتہ بودند۔
اینک آمدہ اند۔ عجب آمد کہ بہ نامہ ننواختند۔ ہمانا بہ ہم نشینے و
ہمزبانی من با تفتہ ہم زبانی و ہم نشینی خویش با من شناختند و حقا کہ
چنیں است دوش یکے از شاہزادگان تیمورخانیہ بزم سخن آراستہ
بود و سخن سنجاں را بہ غزلخوانی خواندہ۔ مرا کہ بہ گفتن ریختہ سری
نماندہ اگرچہ دل بہ سگالش خستہ بودم۔ آما روزیکہ شب
بداں انجمن بایست رفت خاصہ ہنگامی کہ سوارہ رہ مے بردم
بیتی چند بے خواست از دل غم زدہ سر برزد۔ چنانچہ بہ شمامے

فرستم و می خواہم کہ ہم درین زمین غزلے گفتہ می فرستند[1]

از اسد اللہ نگاشتہ ۱۶ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ

مطابق ۲۱ فروری ۱۸۴۸ء

---

[1] جو کچھ غالب ناکام پہ گزری وہ کہنے کے قابل نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس بندہ کا کوئی خدا نہ تھا۔ (اسی قبیل کا ایک شعر دیوان اردو میں بھی ہے ؂

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۔ فکر گواہ ہے اور مشاہدہ شاہد کہ کانٹ چھانٹ آرائش کے لئے ہے اور صفائی نمائش کی خاطر۔ سر کو جب آراستہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ اور شراب کو پیمانوں میں الٹنے سے پہلے چھان لیتے ہیں۔ بانس کے ٹکڑوں کو جب تک کانٹ کانٹ کر چھوٹا نہ کریں اسے تراش کر قلم نہیں بنا سکتے۔ جب تک کاغذ کے ٹکڑے نہ کریں اس کا نام خط نہیں رکھ سکتے۔ اس کارگاہِ تعمیر و تخریب میں کوئی تعمیر تخریب کے بغیر نہیں اور کوئی تخریب تعمیر کے بغیر نہیں۔ مجھے مٹی سے پیدا کیا اور آسمان پر اٹھا لے گئے اور کچھ عرصہ تک میرے اس مرتبہ کی نگہداشت رکھی اور اس مرتبہ پر قائم رکھا۔ بعد ازیں زمین پر دے مارا اور میرا پیکر زمین پر ایک ایسا نقش بن کر رہ گیا جسے کسی نشتر کی تیز نوک اس خاک (یعنی عالم وجود) سے اٹھا نہیں سکتی۔ گویا

مجھے اس عالم تخریب و تعمیر میں جو اچانک وجود میں آئی لے گئے اور میری جگہ ایک خستہ کو وجود میں لے آئے جو مرگ و زندگی اور ہنسنے رونے میں کوئی تمیز نہیں کرسکتا۔ یارب یہ پیکر (صورت انسانی) جو خاک پر نقش ہوگیا اور یہ جو نقش جو اس پیکر کی وجہ سے خاک میں بیٹھ گیا ممکن ہے عن قریب روئے زمین سے زیر زمین چلا جائے۔

ان دنوں جب میں ظلم کی قید سے چھٹ گیا ہوں اور غم کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہوں۔ سخنور جادو بیان واز خود رفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کا خیال آگیا۔ میں نے سنا کہ وہ کرم فرما جو وطن گئے ہوئے تھے آپ کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ تعجب ہے کہ اپنے خط میں اس کا ذکر نہ کیا۔ البتہ میری اور تفتہ کی مجالست و گفتگو کو میری اور اپنی مجالست و گفتگو جانا ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔

کل رات شہزادگان تموریہ میں سے ایک نے مشاعرہ منعقد کیا تھا اور شعراء کو غزل خوانی کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ میں نے اس میں بہت دل لگایا لیکن طبیعت ریختہ کہنے پر مائل نہ ہوئی لیکن اس روز جس کی رات مجھے اس انجمن میں شرکت کرنی تھی تو خاص اس وقت جب میں سواری میں جارہا تھا چند شعر خود بہ خود دل غمزدہ سے نکل آئے چنانچہ ان اشعار کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اس زمین میں غزل کہہ کر مجھے بھیج دیں۔

؎ جاں فزا ہی بادہ جسکے ہاتھ میں جام آگیا۔ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

اس غزل۔ جس کا مطلع۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں، خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔ اس میں کل سولہ اشعار ہیں۔ یہ غزل کا تیرھواں شعر ہے، اس کے مضمون کی بابت غالب میر مہدی مجروح کو ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:۔

"میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں۔ آگ تاپتا ہوں ـــ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتشِ سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔

؎ ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے ۔۔۔ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

خط بنام عبدالجلیل جنوں میں لکھتے ہیں:۔

"؎ ملنا ترا اگر نہیں۔ ۔ ۔ ۔ الخ یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے خیر تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں یعنی جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سمجھ لیا تھا۔ مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔"

؎ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟ یہ غزل جس میں نو اشعار ہیں دلی اردو اخبار میں ۱۲ر فروری ۱۸۵۲ء میں چھپی تھی۔ اس غزل پر مرزا نورالدین شاہی نے ایک مخمس جس میں آخر کے دو مصرعوں میں غالب کا پورا شعر باندھا تھا منذکرہ مخمس

بہت پسند کیا گیا اور بہادر شاہ ظفر نے پانچ بار اس کو پڑھوا کر سنا اس کے علاوہ اس غزل کا مذکورۂ بالا مطلع قاضی عبد الجلیل جنوں کو خط لکھتے وقت غالب نے بھی استعمال کیا ہے۔ انھوں نے غالب سے غزل کی فرمائش کی تو انھوں نے تحریر کیا :-

"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا اگر میری نظم و نثر میں سے کوئی رسالہ آجائے تو وہ مول لے کر خدمت عالی میں بھیج دیا جائے گا۔ دل ہی تو ہے۔۔۔۔ الخ
ایک دوست کے پاس بقیۃ النہب والغارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے اس سے یہ غزل لکھ کر بھیج دوں گا ؎

اسی غزل کے چھٹے شعر کی بابت لکھتے ہیں :-

حسن، اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں؟

مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں۔ داد دینا حسنِ عارض اور حسنِ ظن دو صنعتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اسکا صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا پس جب اس کو اپنے پر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے اس حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کہہ دیا تھا رقیب عاشق صادق نہ تھا ہوسناک آدمی تھا اگر پاس امتحان

درمیاں آتا تو حقیقت کھل جاتی۔

؎ تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو؟

غالب نے نواب علائی کو ایک مکتوب میں لکھا:۔

"اشعار تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں، عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو، گورمنٹ کا بھاٹ تھا، جب کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، اب بھی متروک۔ نہ غزل نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں۔ اصلاح پا جاتے ہیں۔ باور کرنا اور مطابق واقع سمجھنا تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔"

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہے۔
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔

یہاں پر متذکرہ غزل کا مطلع لکھتے وقت غالب نے ردیف بدل دی۔

؎ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

"مولانا حالی مرحوم نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے مسجد و مدرسہ و خانقاہ ہمارے لئے یکساں ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ہمراہ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا اب مسجد، مدرسہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر پی لینے

ہیں کوئی عار نہیں۔ یعنی یہ مقامات اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں۔ وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ مرزا غالب شوخی برتنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ یعنی مسجد، مدرسہ، خانقاہ جائے عزت ہیں مگر مرزا صاحب نے ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے:

غالب ہمہ اوست کے قائل تھے وہ اس شعر کے مرادف ”زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر۔ یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو“..... خدا کے وجود کے پیش نظر اسے ہر جگہ موجود سمجھتے تھے اس سے انکار نہیں کہ میکدہ چھٹنے سے پہلے جب وہ حریفوں کے ساتھ مے نوشی فرماتے ہوتے تھے تو ان کے شعور میں خدا کا وجود وہاں بھی بیدار رہتا ہوگا اسی لئے شراب چھٹنے کے بعد مسجد، مدرسہ اور خانقاہ نیز میکدہ میں وہ تخصیص نہیں پاتے۔

مطلع ”گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو۔ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو؟“

یہ غزل اور غزلوں کے ہمراہ دلی کے اردو اخبار میں شائع ہوئی۔ جب قلعۂ معلّٰی میں مشاعرہ ہوا تو اس میں مذکورہ غزل غالب نے پڑھی۔ اس میں دس شعر ہیں۔ مصرع طرح بادشاہ دیا کرتے تھے اس بار مصرع طرح دیا گیا تھا ”فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو“ غالب نے مقطع میں بادشاہ کے طرحی مصرع کو یوں نظم کیا ہے ” مجھے جنوں نہیں، غالب، ولے بقول حضور۔ فراق یار میں..... الخ

غالب نے حاتم علی مہر کو لکھا کہ ان دنوں میں دو غزلیں لکھی ہیں۔ ایک تو ”دریا نہ ہوا“ سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل ”رواں کیوں ہو“ اب

بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے مکتوب میں انھیں کو لکھا۔

"تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم واندوہ کا شکوہ گذار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں درخور افزائش ہے" بقول غالب ؎

کسی کو دیکے دل، کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو۔ نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں۔ سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہمسے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو۔ نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

ہے سبب یہ شعر ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے   ہوئے تم دوست جسکے اسکا دشمن آسماں کیوں ہو

غالب اپنے ایک مکتوب بنام علاء الدین احمد خاں میں یوں لکھتے ہیں:-

"مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً نہیں فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتر کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ آہاہا ؎

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار   اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہیں

یہ نواب تفضل حسین خاں بنگش والی فرخ آباد کی طرف اشارہ ہے جنکے والد کی مدح سرائی میں ان کی مشہور غزل ہے جس کا مصرع ہے۔ بناہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے ؎

مطلع سے اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے۔ مگر اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے
اسکا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا   آپ لکھتے تھے ہم، اور آپ اشعار کہتے تھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے غلط نامے میں اس شعر سے پہلے دو مزید اشعار بہم پہنچائے ہیں۔ جو ان کو جناب وحید الدین نظامی بدایونی کے مملوکہ مخطوطے میں سے ملے ہیں۔ چنانچہ یہ دو شعر شامل کر دیے ہیں اگر یہ اشعار غالب کے مانے جائیں گے تو گویا کہ انھوں نے تین اشعار میں اپنی ساری زندگی کی تلخی پیش کر دی ہے۔ انھیں اس کا تو شدید احساس تھا ہی کہ ان کے سرمایۂ حیات کا کوئی صحیح قدرداں نہیں ملا۔ نہ ہی کسی نے اس کی حقیقت کو پہنچانا لہذا لکھ لکھ کر جمع کرتے رہے حتیٰ کہ اسی میں زندگی پوری ہو گئی قلق رہا تو صرف اس امر کا کہ ان کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی مقطع نے اولذکر دونوں اشعار کا صحیح پس منظر سمجھنے میں پوری مدد کر دی ہے۔

مطلع ؎ گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے۔ تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

غالب نے ایک خود نوشتہ بنام کلب علی خان والیٔ رام پور میں اس حادثہ کے سلسلہ میں لکھا تھا جو رام پور سے واپسی دلی پر مراد آباد میں دریا پار کرتے وقت پیش آیا تھا پورا خط ملاحظہ ہو۔

"بعد تسلیم معروض ہے مراد آباد پہنچا بعد پالکی کے اوترآلی کے پل کا ٹوٹ جانا گاڑی اسباب یہاں تک کہ رخوت خواب کا مع آدمیوں کے اسی زمہریر کے میدان میں رہنا بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو ان پر گزری وہ جانیں میں مراد آباد کے سرا میں ایک چھوٹے سے حویلی میں ٹھہرا بھوکا پیاسا کمبل اوڑھ کر پڑ رہا یہ شعر اپنا پڑھ

پڑھ کر صبح کی۔ (شعر اوپر درج ہے) صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔
صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آ۔ بے
اٹھا کر سعد الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب
نے وہ تعظیم و تکریم اور سعد الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم
کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی ناگاہ مولوی محمد حسن خاں صاحب
بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے پانچ دن وہاں
رہا بھائی نواب مصطفےٰ خاں بہادر وہیں آ کر مجھ سے ملے دوسرے
دن وہ رہگرائے دار السرور رام پور اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی
ہوا دوشنبہ ۷ر شعبان ۸ر جنوری ۱۸۶۶ درغم کدہ پہ پہنچا۔ حضور
کے اقبال کی تائید تھی ورنہ میں اور جیتا دلی پہنچتا ؎

مغلوب علۂ غم دل غالب حزیں کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
از ر امپور زندہ بہ دہلی رسیدہ است مارا بریں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عز و جاہ روز افزوں نجات کا طالب غالب
چہار شنبہ ۲۲ر رمضان ۱۰ر جنوری
سال جشن حضور

اسی سلسلہ کا ایک شعر اور ہے "سمبل آئے، ساحل آئے، دل آئے" والی
غزل میں۔ ملاحظہ ہو ؎
ان کو کیا علم، کہ کشتی پہ مری کیا گزری دوست جو ساتھ مرے تا لب ساحل آئے

تین شعر ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم!
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

ان کے بارے میں عبدالرزاق شاکر کو یوں رقم طراز ہیں:۔

۱۔ "مثل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو، موجودیت لالہ کی منحصر نمائشِ داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیئے کہ پھول کے درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے، بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجودِ محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت، داغ۔ اور داغ مخالف راحت اور صورتِ رنج۔

۲۔ کلی جب نئی نکلنے بصورتِ قلبِ صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگِ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بہ معنی مایہ آرام۔ مصرعہ، برگِ عیشی بگورِ خویش فرست۔ برگ اور سرو برگ بہ معنی ساز و سامان ہے۔ خوابِ گل، شخصیتِ گل بہ اعتبارِ خموشی و برجا ماندگی، پریشانی ظاہر ہے یعنی

شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بہ صورت دل جمع ہے باوصف جمعیت دل۔ گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔

۴۔ پشت دست۔ صورت عجز جنیں بدنداں وکاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو۔ ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو ——— ۔ (عود ہندی)

مطلع ۔ تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے حوران خلد میں تری صورت مگر ملے[1]

اسی غزل کا ایک شعر ۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

کی بابت قاضی عبد الجلیل جنوں کو لکھتے ہیں: —

"یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا کہ یہ قاصد کہیں معشوق پہ عاشق نہ ہو جائے، ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کریگا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا مکتوب

---

[1] ۔ چچا غالب کی یہ بڑی معرکتہ الآرا غزل ہے۔ متذکرہ بالا مطلع پر نواب جعفر علی خاں اثر مرحوم نے کئی صفحے قلمبند کئے ہیں جو لائق مطالعہ ہیں۔ مطالعۂ غالب صفحہ ۱۲۱ (عارف)

الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا کیسا خط کیسا. جواب دیوانہ بن، کپڑے
پھاڑ، جنگل کو چل دیا اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم
سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے کسی کے باطن سے کسی کو کیا خبر!
اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے، تو
اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعوی عاشق نہ
ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا. جواب کا طالب غالب
جون ۱۸۶۴ء.

مطلع ؎ کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

جنوں بریلوی کو اس شعر کا مطلب یوں لکھتے ہیں:-
"اس میں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں شاعر اپنا قصد
کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا. مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے
شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس
چلا جائے"

نواب انوار الدولہ شفق سے اس شعر کی تشریح یوں کرتے ہیں. شعر ہے ؎
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

"یہ دن مجھ پر برے گزرتے ہیں. گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے
جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس تموز میں

میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے" ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میر مہدی مجروحؔ کو اس شعر کے باب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو؟ "لسان الغیب" نے دس برس پہلے فرمایا ؎ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ میاں بارہ دستر(۱۲۷) کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعدِ رفعِ فساد سمجھ لیا جائے گا"

؎ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ـــــــ موت آتی ہے پر نہیں آتی

غالب نے لطیف بگرامی کو لکھا ہے:۔

"فخرِ ایجاد دکھو میں" مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے۔ غالب نیم مردہ، نیم جان رہ جائے، مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی۔ اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا اسی برس کا بڈھا ہونے کو آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ شراب کم بخت چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں۔ "جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد" "کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب"

؎ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو، کہ مدعا کیا ہے

میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میر مہدی دمیر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھا۔" میں کبھی منھ میں زبان رکھتا ہوں۔ کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے ماجرا یہ ہے کہ تمھارا بھی تو کوئی خط نہیں آیا جس کا جواب لکھتا"۔

اسی غزل میں ایک قطعہ بند ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

مطلب یہ کہ اے خدا، جب کہ ساری دنیا میں تو ہی تو ہے اور تیرے سوا کسی شے میں اور کوئی موجود نہیں یعنی پنہاں نہیں ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہنگامہ کیا ہے۔ یعنی یہ دیر و حرم، ناقوس و اذاں، سبحہ و زنار اور کلیساؤ مے خانہ اور من تو کی بحث آرائی کیوں ہے؟"۔

شعر:۔ رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے۔ اگر بوئے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
ریشگی بہ معنی خلش۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار لیلیٰ کی فصد کھولی گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ مجنوں کے رگ بازو سے خون جاری ہو گیا اس شعر میں اسی واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔ خط بنام مجروحؔ

"پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے۔ قد اس کا کتنا لمبا ہے۔ ہاتھ پاؤں کیسے ہیں۔ رنگ کیسا ہے۔ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے قسم جسم و جسمانیت میں سے نہیں۔ یہ ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں

ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے یعنی۔
کہنے کو ہے دیکھنے کو نہیں۔ پس جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا
اس صورت میں ہمارا ہونا نہ ہونے کی دلیل ہے"

ے ظلمت کدے میں میرے، شبِ غم کا جوش ہے۔ اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے۔

غالب نے شاگرد کو اس کی تشریح لکھی ہے:۔

"اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے" یہ خبر ہے۔ "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیر ہی اندھیرا، ظلمت غلیظ سحر نا پیدا گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک "دلیل صبح کی بودیر ہے۔ یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے بس دیکھا چاہئے جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہو گی وہ گھر کتنا تاریک ہو گا"

ایک قطعہ بندے خامہ میرا کہ وہ ہے باربد بزم سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہِ کواکب سپہ مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

باربد۔ خسرو پرویز کے دربار کا ایک مشہور مغنّی تھا۔ جو بادشاہ کی مدح میں باربد کی طرح نغمہ سرائی کرتا ہے۔

مطلع ؎ ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟ تمھیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

اس غزل میں دس اشعار ہیں۔ غزل مذکور مہر نے غالب سے مانگی۔ انھوں نے غزل بھیج دی اور لکھا۔

"اگر ہم فقیر سمجھے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق پختہ ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی ——" نیز یہی غزل شیو نرائن آرام کو روانہ کر کے انھیں تحریر فرمایا "یہ تمھارا اقبال ہے کہ تو شعر یاد آگئے۔ ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ جو آیا چاہتی ہیں۔ تین ہفتہ کا گودام تمھارے پاس فراہم ہو گیا" اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیو نرائن اپنے ہفتہ وار اخبار میں غالب کا کلام شایع کیا کرتے تھے۔

حکایت ہے کہ ایک دن حضرت ذوق استاد بادشاہ ظفر پالکی میں جا رہے تھے کہ غالب کی نظر ان پر پڑ گئی۔ چونکہ دونوں میں ہم عصرانہ چشمک چلا کرتی تھی غالب نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا جسے ذوق نے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے شکایت کر دی۔ غالب جب حاضر دربار ہوئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ آج آپ نے کون سی نئی غزل کہی ہے۔ وہ بادشاہ کا مطلب سمجھ گئے اور پوری غزل سنا دی۔ مگر مقطع کا یہ مصرعہ بدل دیا ؎

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مقطع ؎ عشق نے، غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مرزا تفتہ کو اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی
لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔
بیٹھ نہیں سکتا ؎ ضعف نے غالب نکما کر دیا۔

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے ایک جلسہ میں اپنا ایک مضمون پڑھا فرماتے
ہیں۔

"بوڑھا ہوں۔ ناتواں ہوں۔ سچ اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں
"ضعف نے غالب نکما کر دیا"

ریاض الدین امجد نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ:۔

میں نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا "عشق نے غالب نکما کر دیا"
تو فرمایا "بھائی چپ رہو۔ یوں کہو "ضعف نے غالب نکما کر دیا"
یا "دہر نے غالب نکما کر دیا" عشق کیسا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا"

مگر مولوی احمد حسن قنوجی کو جو مکتوب انھوں نے بھیجا اس میں وہ یوں رقم
طراز ہیں:۔

"یہ درویش گوشہ نشین تمھارا دوست اور تمھارا دعا گو ہے "عشق نے
غالب نکما کر دیا"۔۔۔۔۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی! اضمحلال قویٰ
ضعف دماغ، فکر مرگ، غم غنی جو مجھے آپ دیکھ گئے ہیں۔ میں اب
وہ نہیں ہوں"

غزل ؎ کب وہ سنتا ہے کہانی میری | اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلش غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ | دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟ — مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال — بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے، مقابل میرا (۵) — رک گیا دیکھ روانی میری

قدر سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

(۵) مذکورہ شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو ایک خط میں تشریح کی ہے:

"تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم۔ لفظ مقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہے۔ جیسے حریف، کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خوے و عادت ضد ہمدگر ہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"

شعر: منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

منشی نبی بخش حقیر کو ۱۰ر جنوری ۱۸۵۳ء کے مکتوب میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

"کیا کروں؟ مدت غمزدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج و الم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں۔"

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

اسی شعر کو اپنے ایک خط میں یوسف مرزا کو بھی لکھا۔ علاوہ ازیں چودھری عبدالغفور کے مکتوب میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:۔

"حضرت سچ نویس یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا اتنا تنگ کر دیا ہے ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رو یا کروں گا۔ دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشین ہے نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات سے منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے۔"

چند اشعار:۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ بنے (۲) تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۲) اس شعر کی تشریح کے سلسلہ میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:۔

"بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بہ طریق طعن و تعریض معشوق سے کہے گئے ہیں۔ موت کی راہ نہ دیکھوں! کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے۔ ایک دن آئے ہی گی انتظار ضائع نہ جائے گا۔

تم کو چاہوں ، کیا خوب ، کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے ۔
یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال
کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں
تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں ۔ اس میں خوبی یہ ہے
کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ
تو تم کو بلا نہ سکوں "

متذکرہ بالا غزل غالب نے حقیر کو اس غزل کے ہمراہ ارسال کی تھی جس کا مطلع
یہ ہے

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے	اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

چند اشعار ہے

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے	ولے مجھے تپش دل ، مجال خواب تو دے
کرے ہے قتل ، لگاوٹ میں تیرا رو دینا	تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے
اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے	کہا جو اس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

اس غزل کے باب میں مرزا علاء الدین کو یوں بے تکلف کے ساتھ لکھا :۔
"پچاس سال کی بات ہے الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی
نکالی ۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی ۔ بیت الغزل یہ ہے پلا دے
اوک سے ساقی .... المخ اسد خوشی سے ...... الخ
اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع
اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنا لی ہے

اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا پانچ شعر کی
اڑ گئے...... جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے
کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں
نے خلط کر دیا ہو؟"
یہ شوخی غالباً غالب کے ان ادبی رقیبوں سے سرزد ہوئی ہوگی جو ان کے
ہم عصر تھے اور جن سے ان کی ادبی چشمکیں چلا کرتی تھیں۔
مقطع کے متعلق بھی یہ لطیفہ قرین قیاس ہے کہ غالب ایک بار بستر پر
پڑے کراہ رہے تھے۔ میر مہدی مجروح موجود تھے۔ وہ پاؤں دابنے لگے۔ غالب
نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہ گار کرتا ہے۔ وہ نہ مانے اور کہا۔ آپ
کو اتنا ہی احترام ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجیئے گا۔ تو وہ بولے ہاں اس کا
مضائقہ نہیں مگر جب پیر داب چکے، اجرت طلب کی تو ازراہِ تمسخر بولے بھیا کیسی
اجرت تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے۔ بات آئی
گئی ہو گئی۔

؎ ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اس شعر کے بارے میں مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں " میرا حقیقی بھائی
مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔ کیا ہنس اور کہاں اس کا ملنا۔ یہاں جان کے
لالے پڑے ہیں۔

ہے موجزن اک...... الخ

؎ بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

اس غزل کا مطلع، اور مقطع سے سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی۔
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے۔ غالب نے مہر کے خط میں تحریر
کیا ہے نیز اس باب میں نواب علائی کو بھی لکھا ہے:۔

"تم نے اشعار جدید مانگے۔ خاطر تمھاری عزیز۔ ایک مطلع، صرف
دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخل دیوان بھی
نہیں۔ ان پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی
ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں۔"

ایک مقطع سے غالب برا نہ مانو جو واعظ برا کہے۔ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
مذکورہ مقطع کے باب میں سیف الحق سیاح کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"بھائی سیف الحق! تمھارا خط پہنچا۔ قاضی صاحب بڑودہ کو معاف
رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور
اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں
تم برا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور
اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو
...... غالب برا نہ مان ...... الخ"

ے گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں
نے پاسباں کے لئے مولانا حالی کا قول ہے کہ "اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید
دو ہی چار نکلیں گے۔ مولانا صدرالدین آزردہ جو غالب کی طرز کو نام رکھتے تھے
اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ اس شعر کی ایک اور خوبی کی طرف

حالی نے اشارہ کیا ہے۔ اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت دوسری بات پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے علاوہ برایں روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت قابل تعریف ہیں ۔

شعر؎ بزم میں، میزبانِ قیصر وجم — رزم میں اوستادِ رستم و سام

قیصر وجم۔ قیصر روم کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔ جم ایران کے ایک بادشاہ کا نام ہے جو بڑا مہماں نواز تھا۔ شاہ ظفر کی مدح کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ اس کی محفل میں قیصر وجم جیسے جلیل القدر بادشاہ اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور میدانِ رزم میں وہ فن سپہ گری میں ایران کے مشہور پہلوانوں، رستم و سام کو طریقۂ جنگ کی تربیت دیتا ہے۔ رستم و سام دنیا کے بڑے پہلوانوں میں تھے۔ سام، رستم پہلوان کے دادا کا نام تھا۔

اشعار؎ چشم بد دور! خسروانہ شکوہ — لوحش اللہ، عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم — جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو، گودرز و بیژن و رہام

ایرج، تور، خسرو، بہرام۔ ایران کے کیانی بادشاہ تھے۔ گیو، رستم کا داماد تھا۔ بیژن کی داستان شاہنامہ فردوسی میں رقم ہے۔ گیو، گودرز، بیژن، رہام یہ سب ایران کے مشہور و معروف پہلوان تھے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یہ سب پہلوان تیرے زورِ بازو کو تسلیم کرتے ہیں۔

شعر:۔ ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

طغرل اور سنجر دھوکہ دے کر ملک کے وارث بن بیٹھے تھے۔ جب بادشاہت شاہ ظفر کے قبضہ میں آئی تو معلوم ہوا طغرل و سنجر جو فریب دے کر بادشاہ بن گئے تھے۔ وہ غلط تھے۔ ملک کے صحیح وارث بہادر شاہ ظفر ہی تھے۔

شعر:۔ دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

لقا، مصر کے شاہانِ فراعنہ میں سے ایک کا نام تھا جو اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں موتی پرو کر رکھتا تھا۔ غالب کی مراد اس شعر سے یہ ہے کہ شعر گوئی کی قابلیت کے لحاظ سے میری تحریر لقا کی ڈاڑھی کی موتیوں کی لڑی ہے مگر وائے ناکامی کہ دنیا بھر کے تمام غم واندوہ میرے سینے میں اس طرح بھرے ہوئے ہیں جیسے عمرو عیار کا کچکول جو دنیا بھر کی چیزوں کو اپنے میں سمو لیتا تھا۔

شعر:۔ ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

غالب ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"یہ قطعہ نوروز کی مبارک باد پر مشتمل ہے اور نوروز برج حمل میں داخلے کے وقت منایا جاتا ہے۔۔۔۔ تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۰ مارچ کو واقع ہوئی اور کبھی ۲۱ کبھی ۲۲

بھی آپڑتی ہے۔ اس سے تجاوز نہیں۔ مطلب شعر کا فرماتے ہیں
اس وقت تک حضرت خضر کا سکندر سے تیراز کرنا ممکن نہیں ہے
جب تک آب حیات سے زبان لب کو پاک نہ کر لیں۔

شعر: نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں مدعائے ضروری الا اظہار

یہ شعر اس عرض داشت میں ہے جو منظوم بادشاہ ظفر کو غالب نے
شش ماہی تنخواہ کے ماہ بہ ماہ تقسیم کیے جانے کے سلسلہ میں گزاری
تھی۔ اسی شعر کو انھوں نے نواب کلب علی خاں کو ایک خط میں
یوں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تقدیم مدارج تسلیم معروض ہے۔ توقیع رافت عز ورود لایا۔
میں نے ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعہ سے بابت تنخواہ اگست ۱۸۶۹ء
سو روپیہ وصول پایا ۔

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الا اظہار۔

پیر و مرشد، حسین علی خاں کی سسرال والوں کا بڑا تقاضہ ہے۔
زندگی مشکل ہو گئی ہے۔ تیماً للہ۔ سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت
کے مزاج میں آوے وہ عطا کیجئے اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ
تنخواہ مقرر کر دیجئے۔ لیکن یہ دونوں امور جلد صورت پکڑ جائیں
عرضداشت دو تنخواہ اسد اللہ معروضہ، ستمبر ۱۸۶۹ء"

شعر: آپ نے مَسّنِیَ الضُّر کہا ہے تو سہی   یہ بھی یا حضرتِ ایوب! گلا ہے تو سہی

یہ غزل غالب نے نواب علائی کے اصرار پر لکھی تھی اور ان کے والد ماجد نواب ضیاء الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کو ارسال کرتے ہوئے تحریر فرمایا "وکیل حاضر باش دربار اسد اللہ یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے مطرب کو سکھائی جائے جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا جاڑوں میں آکر میں بھی سن لوں گا۔"

مفہوم شعر حضرت ایوب پیغمبر سے منسوب ہے جو صبر کے لئے مشہور تھے۔ خدا نے ان کے صبر کا امتحان لینے کے لئے انھیں سخت بیماریوں میں مبتلا کر دیا مگر انکے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ آخرش غیب سے ندا ہوئی اے ایوب! زمین پر ٹھوکر مار۔ آپ نے ٹھوکر ماری جس سے چشمۂ آب رواں ہو گیا اس پانی سے انھوں نے غسل کیا اور صحت یاب ہوئے نیز مال و دولت و اولاد سے سرفرازی بخشی گئی۔

ایک قصیدہ کا مطلع ؎

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ   جنابِ عالیِ المن، بروِن والا جاہ

یہ قصیدہ جو اکیس اشعار پر مشتمل ہے غالب نے کہہ کر منشی شیو نرائن کی فرمائش کا تکملہ کیا تھا جو غالب نے ان کے فرزند تولد ہونے کے باب میں کہا۔ منشی شیو نرائن کو قصیدہ روانہ کرتے وقت خط میں لکھتے ہیں:۔

"کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ ۲۱ شعر

کا قصیدہ کہہ کر تمھارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست خصوصاً مرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فن تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدہ میں بروش خاص سے ۱۸۶۶ء کا اظہار کر دیا ہے خدا کرے تمھارے پسند آوے خود قدر دان سخن ہو اور تین استاد اس فن کے تمھارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔

شعر:- آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب۔ تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اژدہام

غالب کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار الہلال میں ایک مضمون لکھا جسے رسالہ زمانہ کانپور نے جولائی ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں نقل کیا۔ قصیدہ مذکور کا یہ انیسواں شعر ہے جس میں ریل کھلنے کا ذکر ہے۔ اور اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتہ سے رانی گنج تک جو ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہے جاری ہوئی تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلی تک لے جانے جانے کے لئے جاری رہا۔ پہلے آگرہ سے جمنا کے غربی ساحل کے ہم دوش داغ بیل ڈالی گئی اس کے بعد ٹونڈلہ جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی دریائے جمنا کے مشرقی کنارے چولا تک ۱۸۶۴ء میں کھولی گئی انھیں ایام میں جمنا کا پل بھی زیر تعمیر تھا ۱۸۶۶ء میں پل مکمل ہوا۔ یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار ریل اس پر ہو کر گزری۔

ایک قصیدہ کے چند اشعار ؎

مرحبا سال فرخی آئیں | عید شوال و ماہ فروردیں
شب و روز افتخار لیل و نہار | مہ و سال اشرف شہور و سنیں

صرف اظہار ہے ارادت کا ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں

مدح گستر نہیں دعا گو ہے غالبِ عاجزِ نیاز... آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں تم رہو زندہ جاوداں آمیں

یہ قصیدہ جس کے دو اشعار از ابتدا اور تین اشعار آخر کے بمعہ مقطع درج کیے گئے ہیں۔ (قصیدہ کافی طویل ہے) غالب نے نواب کلب علی خاں کے غسل صحت کی تقریب پر قلم بند کیا تھا۔ لیکن اصل واقعہ یوں ہے کہ قصیدہ مذکور نواب یوسف علی خاں کے غسل صحت کی تقریب پر ارسال کیا تھا جیسا کہ بنام غالب نواب ممدوح نے قصیدہ کی تعریف میں ایک مکتوب روانہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارک باد کا جو آپ نے بھیجا ہے وہ پہنچا اس کے آنے سے سرورِ صحت دوبالا ہوگئی۔ ایسی نظم ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں۔ حقا کے اللہ تعالیٰ نے آپکو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے۔ جس کمال کو دیکھئے اس میں آپ کی ذات نزد کامل ہے۔ آپ کا بدیہ مرسلہ اکثر نقل محفل رہتا ہے جو سنتا ہے، جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے تب کہیں ایک شخص کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ اللہم بصحت عافیت طول عمر عطا کرے اور تادیر گاہ اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفیض ہوا کریں۔ باقی خیریت ہے......"

ذیل کا ایک قطعہ غالب نے نواب کلب علی خاں کو ملفوف ارسال کیا تھا

مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک — رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیٔ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟ — بیار و لا مئے گلنار گوں، بیار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — درِ حضور پہ، اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے — "امیرِ کلب علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزاروں برس پر کچھ انحصار نہیں — کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے — بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات — خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

اس قطعہ کے باب میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت۔ بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عز ورود لایا۔ اگرچہ مینھ اس قدر برسا ہے جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں۔ مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے۔ ابر رحمت کے شکریہ میں قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں بہ نظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حد ادب"

غالب مندرجہ ذیل قطعہ کے باب میں نواب کلب علی خاں والی رام پور کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے کہ ایک قطعہ ۵ اشعر کا بھیجتا ہوں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کی طرز نئی

. "مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا۔ زیادہ حدِ ادب......"

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں — حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر — کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ — اس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے — مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں — ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام — دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں — سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
جنت اباغِ ہمایونِ تقدس... آثار — کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس — خضر بھی یہاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم
مدح کے بعد، دعا چاہیے اور اہلِ سخن — اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم
حق سے کیا مانگئے، ان کیلئے جب ہو موجود — ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل — دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا، غالبِ عاصی کے خداوند کو دے — دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اولاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال — ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید نے لکھا ہے کہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب (جو مولف کے چچا تھے) غالب سے پہلی ملاقات کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ "جب ہم گوڑگانوے میں ہیڈ ماسٹر تھے وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر کو دان کے تبادلہ کا موقع پیش آیا۔ صاحب موصوف ہمارے حال پر

نظرِ عنایت خاص فرماتے تھے ان کے مفارقت کے سلسلہ میں جو جلسہ قرار پایا اس میں لوگوں کی رائے ہوئی کہ کوئی چیز بطور یادگار نذر دینی چاہیے۔ چنانچہ کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کی رائے سے نقرئی قلمدان دینا تجویز ہوا۔ قلمدان پر کوئی شعر بھی کندہ کرانا قرار پایا اس سلسلہ میں آشوب، غالب کے پاس آئے یہ تھی ان کی پہلی ملاقات جس کے بعد دونوں کے باہمی روابط اس درجہ بڑھ گئے کہ غالب آشوب کو فرزندِ ارجمند لکھا کرتے تھے۔ غالب نے قلمدان کے لئے جو قطعہ کہا تھا وہ درج ذیل ہے ؎

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم   عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلم دان ہے نذر   مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

شعر ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب   نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

کسی موقعہ پر خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی خصوصیات پر دربار میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ غالب موجود تھے اسی وقت یہ شعر کہا۔

شعر:۔ خدا سے میں بھی چاہوں ازرہِ مہر "فروغ۔۔۔ مہر: میرزا حاتم علی مہر" غالب نے حاتم علی مہر کی مثنوی "شعاعِ مہر" کو پڑھ کر یوں لکھا "مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے، کیا کہوں کیا حظ اٹھایا۔ اگر اس انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اردو کہلائے گی۔"

دم واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

یہ شعر انتقال سے قبل اکثر غالب کے وردِ زبان رہتا تھا۔

ے ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے — فراز مسند عیش طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات — کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

جب کہ سید غلام بابا نے — مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات — کہ کواکب ہوئے تماشائی

یہ دونوں قطعات مرزا غالب نے بہ تقریبِ شادی سید غلام بابا ازمیں سورت لکھے تھے۔ مگر تاریخ نکاح نہ لکھنے کا عذر کرتے ہوئے انھیں تحریر کیا۔
"وہ دوست جو مادہ ڈھونڈ لیتے تھے وہ جنت کو سدھارے۔
معذور ہوں اور مجبور ہوں"

ے درم و دام اپنے پاس کہاں — چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

ایک دن نواب زین العابدین خاں عارف مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب حسین علی خاں کھیلتے ہوئے آئے اور کہا دادا جان شیرینی منگا دیجئے اور پیسوں کی تلاش میں غالب کی صندوقچی کھول کر ٹٹولنے لگے اسی ساعت غالب نے یہ شعر پڑھا۔

ے پیر و مرشد معاف کیجئے گا — میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

غالب نے ایک خط نواب انوار الدولہ شفق کو لکھا تھا اس کے متن مطبوعہ عود ہندی میں مذکورہ شعر سرآغاز نامہ ہے۔

ے سنین عمر کے ستّر ہوئے شمار برس — بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

یہ شعر مرزا غالب نے ایک خط میں صفیر بلگرامی کو لکھا تھا۔ جوابی اشعار یہ ہیں ؎

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب　　بہت جیوں تو جیوں اور میں چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غینؔ[1] کی ہے دعا　　خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

؎ ساتھ جلدوں کا پارسل پہونچا　　واہ کیا خوب برمحل پہونچا

غالب نے حاتم علی مہر کو لکھا۔ "بھائی جان! کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام ساتھ جلدوں کا الخ۔ . . . . . .

؎ میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان　　کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

یہ شعر غالب نے میر مہدی مجروح کو ایک مکتوب میں تحریر کیا۔ خط میں لکھا "خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے"

؎ تحریر ہے یہ غالب یزداں پرست کی　　تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی

یہ شعر منظوم سوال و جواب کا آخری شعر ہے جو مرزا غالب نے کلکتہ یونیورسٹی کے لئے رائے بہادر پیارے لال کو ارسال کیا تھا۔

؎ مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے　　یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

شعر مذکور غالب کی آخری جائے رہائش واقع گلی قاسم جان کے سلسلہ میں

---

[1] قاعدہ ابجد کے حساب سے "غ" کے ایک ہزار اعداد ہوتے ہیں اسی قاعدہ ابجد سے تاریخ نکالی جاتی ہے (عارف)

یہ تھی جو عقب مسجد واقع تھا۔ اور متصل دیوان خانہ حکیم محمود خاں تھا۔

؎ آج یکشنبہ کا دن ہے آؤ گے۔ یا فقط رستہ ہمیں بتلاؤ گے!

پیارے لال آشوب دوران قیام دلی بر مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جب کبھی انھیں دیر ہوجاتی تو مرزا کے نذ ایک شعر ضرور لکھ رکھتے تھے مقصد جس کا محض حسن طلب ہوتا۔

؎ کھانا نہ اب کے رہ پرانے ہیں آم

حضرت صفیر بلگرامی جب آرہ سے غالب کی ملاقات کو گئے اور نواب ضیاء الدین خاں کے دولت کدہ پہ قیام کا انتظام ہوا تو کھانے کے ساتھ جو آم چنے گئے وہ ترش نکلے۔ حضرت صفیر آموں کا جو ٹوکرا اپنے ہمراہ لے گئے تھے اس میں سے نصف غالب کی خدمت میں بھیج دیے۔ وہاں سے مصرع مذکور رقم ہو کر آگیا۔

؎ ٹوٹ بیٹھے جب کہ ہم جام وسبو پھر ہم کو کیا آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

میر مہدی مجروح کو غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"رئیس دربار والے مہاجن لوگ سب موجود، اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں، مولوی صدرالدین خاں بلی ماران میں سگ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود ومطرود محروم ومغموم ع ٹوٹ بیٹھے...... الخ

؎ کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں۔ دلی والوں میں اک بچا ہے یہ۔

اس شعر کے بارے میں بھی مجروح کو لکھا ہے:۔

"یہ باتیں تمھاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہوگا
بہ تغیرِ الفاظ لکھتا ہوں ۔ کیوں نہ میرن کو الخ ۔ میر تقی کا مقطع یوں
ہے ۔ میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں ۔ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ" میر"
کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی جگہ "بچا" کیا اچھا تصرف ہے۔"

"روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوتا ہے
پھر انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں
بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ لوگوں کی پاسبانی پر قناعت
نہیں ہے لاہوری دروازہ کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر بیٹھتا
ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات
میں بھیج دیتا ہے"

نواب امیر الدین احمد خاں کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔
"تمھارا شہر میں رہنا موجبِ تقویتِ دل تھا۔ ع گو نہ ملتے تھے
پر اک شہر میں تو رہتے تھے" الخ ۔ بھائی ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی
آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے
دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔ لو صاحب اب
کب وعدہ وفا کروگے؟"

"گر مصیبت تھی تو غربت بھی اٹھا لیتا اسد میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے
ملاحظہ ہو مکتوب غالب بنام نواب یوسف علی خاں مرحوم سابق والئ رامپور
"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آج روز جمعہ ۱۷ رجب ۱۲۸۳ھ اور ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء والا نامہ مع منڈوی تنخواہ اکتوبر ۱۸۶۶ء آیا۔ سو روپے کل آئیں گے۔ سے شاگرد پیشہ اور لعہ قرض متفرق میں جا کر لعہ روپے بچیں گے۔

اسد اللہ۔

پیر و مرشد

رجب کا مہینا چلا حسین علی خاں کے سسرال سے شادی کا تقاضہ ہے ادھر سے جز سکوت جواب نہیں ـــــ کئی دن ہوئے کہ ۱۵ شعر کا قطعہ ارسال ہوا ہے اس کی رسید اس خط میں مندرج نہ تھی خاتمہ کے تین شعر دعائیہ یہاں لکھتا ہوں۔ دعا کا نیا طور ہے
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل۔ دو دعائیں ہیں کہ نہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا غالب عاصی کے خداوند کو دے۔ دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اولاً عمرِ طبیعی، بہ دوام اقبال۔ ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہ امم
نجات کا طالب غالبؔ"

یہ دعائیہ اشعار پچھلے صفحات میں اس قصیدہ کے ہمراہ درج ہو چکے ہیں جو نواب کلب علی خاں کو ارسال کیا گیا تھا اور وہ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ دراں حالیکہ نواب ممدوح سے غالب کی خط و کتابت ۱۸۵۵ء تا انتقال مرگ یعنی ۱۸۶۹ء تک ہوتی رہی۔ مگر چونکہ مندرجہ بالا خط مورخہ ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء سے متعلق ہے یہ دور حکومت نواب کلب علی خاں کا تھا اس لئے کہ موصوف ۱۸۶۵ء میں سریر آرائے مسند ہوئے اور تا مرگ ۱۸۸۷ء تک حکمراں رہے۔

ذیل کا قطعہ تاریخ غالب نے نواب ممدوح کو ارسال کیا تھا اس سے متعلقہ خط بمعہ قطعہ ملاحظہ ہو:-

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ ایک خط مشتمل اپنے حال پر اور ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلہ مغفورہ کے تقریب میں روانہ کر چکا ہوں اب ایک قطعہ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ایک کا تعمیہ ہے لیکن تعمیہ کتنا خوب اور بے تکلف ہے عرضداشت اسد اللہ معروضہ ۲۳ رمضان و ۱۳ اپریل سال حال۔

جناب عالیہ از بخشش حق
بہ فردوس بریں چوں کردہ آرام
سخن پرداز غالب سال رحلت
خلود خلد گفت از روئے الہام

۱۲۷۵ ہجری

غالب کا ذیلی مکتوب نواب ممدوح کو ایک اور ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے ایک رباعی ارسال کی ہے جس سے ۱۲۸۱ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت بسلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے حق تعالیٰ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ جس گروہ پر مہربان ہوتا ہے وہاں حاکم عادل رحیم بھیجتا ہے کہ وہ بہ قوت عادلہ کفر و بدعت کی جڑ اکھاڑ ڈالے اور بہ صنعتِ رحم رعایا کو پالے مصداق اس کا ذاتِ قدسی صفات جناب عالی ہے کہ قمار خانہ کی بنا مٹا ڈالی ہے زہے قانون سیاست

غلہ کا محصول معاف کر دیا ہے روپیہ رعیّت پر نثار کیا ہے زہے
آئین سیاست ۔ رباعی۔

نوّاب کہ شد ز شوکت اقبالش | بخشیدن باج غلّہ از اقبالش
فارغ شد ہر کسی در داد فراغ | ہم فارغ و ہم فراغ باشد سالش

پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ
بھیجتا اس کی رسید میں خط تحسین و آفریں کا شرم آتی ہے۔ کہتے ہوئے
مگر کیسے بغیر کہے بنتی نہیں ہزار روپے کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف عطا ہوا
کرتی تھی وہ قصیدہ مدحیہ میرے دیوان فارسی میں مرقوم اور وہ
دیوان فارسی حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے خطوں کی تصدیق
از روئے دفتر ہو سکتی ہے۔ یہ رسم بری نہیں ہے جاری رہے تو
بہتر ہے زیادہ حد ادب۔ التفات کا طالب۔ غالب پنجشنبہ ۱۹ محرم
۱۲۸۳ھ۔

غالب کا ایک خط اور ملاحظہ ہو جو نواب موصوف کو معہ قطعہ تاریخ ارسال
کیا تھا۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے حضور
کے لشکر نصرت اثر کا سپہ سالار سے نواب معلے القاب جناب
مہدی علی خاں بہادر اکبر آباد پہونچا اور خیام فلک احتشام کا
وہاں نصب ہونا اور رامپور سے اکبر آباد تک گھوڑوں کی ڈاک
کا بیٹھنا اور حضرت کا سنبھل تک بہ سبیل ڈاک تشریف لے جانا اور

وہاں مزاج اقدس کا ناساز ہونا اور دارالسلطنت کو معاودت
فرمانا یوماً فیوماً مسموع ہوا۔ غرض اس عرض داشت کی تحریر سے
یہ ہے کہ حصول جواب سے آبرو اور خیریت و عافیت مزاج مبارک
سے عزو اطلاع پاؤں ط
اخبار میں مسطور اور شہر میں مشہور ہے کہ حضرت اجلاس کونسل
کے واسطے حسب الحکم گورنمنٹ کلکتہ کو تشریف لے جائیں گے
نمک خوار دعا گوئے ومدح گستر میں بہانہ طلب رہتا ہے
اس تقریب کا ایک قطعہ تاریخ ۱۸۶۶ء عیسوی رقم کیا ہے عرض
کرتا ہوں اگر پسند آئے تو اجازت مل جائے اس کو کسی اخبار
میں چھپوادوں ط قطعہ

چو نواب از بہر اجلاس کونسل — بہ کلکتہ از رامپور آورد رخ
عدو راہ گیرد بکش زود دے را — بجو سال اجلاس از بخت فرخ
چو گویند کز کشتن وے چہ خواہی — بگو خدمت اعداد وے امینت پاسخ

امینت لغت پارسی کا ہی مرادف نہی دزد ہی اور قتل کا مشارالیہ لفظ دی ہی جسکے
۱۶ عدد ہیں۔ اور روی کا شمار عدد ہی کے بخت فرخ کے ۱۸۸۲ جب اس میں سے ۱۶
کم کیے تو ۱۸۶۶ رہے۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ھزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ایک قطعہ نذر نواب ممدوح منجانب غالب لمعہ مختصر عریضہ:۔

"حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔
بعد تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو دو گھڑی دن چڑھے نوروز ہے آج ایک قطعہ ہاتھ تھام کر لکھ کر حضور کے نذر بھیجتا ہوں ؎

نوروز و عید از دو جانب ارسال
خو لبست ز روئے وضع و نیک فال

امید کہ این سہ عید نذر نواب
آرند دوام عمر و عزّ و اقبال

نجات کا طالب غالب چہار شنبہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۶ء"

ایک رباعی بہ معہ ایک مختصر خط کے غالب نے نواب ممدوح کو ارسال کی ملاحظہ ہو:۔

".... بعد تسلیم و تعظیم معروض ہے ہنڈوی ملفوف نوازشنامہ کے ذریعہ سے سو روپے مارچ کی تنخواہ کے وصول ہوئے۔
ایک رباعی بھیجتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ دیدبۂ سکندری کے آغاز میں اس کے چھاپنے کا التزام رہے۔

آں کیست کہ بہم باک۔ اجاں باشد ۔ آں کیست کہ ہمسر سلیماں باشد
آں کیست کہ بخشش بغریباں باشد کس نیست مگر کلب علی خاں باشد

...... نجات کا طالب غالب ۲ مارچ ۱۸۶۶ء"

مکتوب منجانب غالب بنام نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور
.... بعد تسلیم معروض ہے کہ نمائش گاہ

سراسر سور[1] رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خونِ جگر کھاتا ہوں۔ کہاں میں وہاں نہیں۔ بالاخانے پر رہتا ہوں۔ اتر نہیں سکتا مانا کہ دو آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور رامپور پہونچ گیا کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر وہ بھی بے پر و بال نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں۔ یہ سب بہ طریق فرضِ محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے بارے میں ہیبت کا قطعہ تاریخ بھیجتا ہوں اگر پسند آئے تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں سے

کالیش گہے درخور شاں خویش
برآراست نواب عالی جناب

بہ بیں چوں طرب را نہایت نماند
بود سال آں بخشش بے حساب

خدایا پسند و خداوندگار
کہ از طبع غالب رود پیچ و تاب

بخشش بے حساب کے بارہ سو بچاس ہوتے ہیں۔ طرب کے کے نہایت بائے موحدہ ہے۔ جب وہ نہ رہے تو دو عدد کم ہوئے ادھر

---

[1] سور بہ معنی رنگ سرخ۔

۱۲۸۳ رہ گئے۔ فہو المقصود اگر حضرت کی مرضی ہو تو دبدبہ سکندری میں یہ تاریخ چھاپی جائے۔ تم سلامت رہو۔ . . . داد کا طالب

غالب ۱۴ ماہ اپریل ۱۸۶۷ء

مرزا نوشہ کا ایک شعر ؂

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

یہ شعر غالب نے قید خانہ میں اس وقت فی البدیہہ کہا تھا جب ایک دن سول سرجن دلی مشیر پاس بغرض معائنہ گئے تھے اور معائنہ کے وقت غالب کے پاس پہونچ کر ان کا حال دریافت کیا تھا۔ غالب کا مذکورہ شعر ان کے دیوان اردو میں موجود نہیں۔ اس تاریخی شعر کے ساتھ جو واقعات رونما ہوئے وہ یوں ہیں کہ غالب سے فیض الحسن کو توال دلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی جس نے انھیں بہ علت قمار بازی قید کرا دیا۔ اس واقعۂ قید کی تاریخ عاصی دہلوی (متوفی ۱۸۹۵ء) نے بہ صورت قطعہ نکالی تھی۔ تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مصرعوں سے بیک وقت ہجری، عیسوی، فصلی، بکرمی چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ غالب کی تاریخ قید میں بہت تضاد ہے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں اس کی بابت ۱۲۶۳ھ لکھا ہے جب کہ مولانا مہر نے ۱۲۶۳ھ عید الفطر مطابق ۲۱ر اگست ۱۸۴۷ء تحریر فرمایا ہے۔ ان دعوؤں کی تردید مندرجہ ذیل قطعہ سے ہو جاتی ہے جس سے تاریخیں نکالی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس واقعہ کا تذکرہ یہاں مقصود ہے ورنہ غالب کی شان میں گستاخی یا ان کی کسی طور پر تذلیل

مراد نہیں۔ کہتے ہیں بروقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے
اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس فریب سے اندرون خانہ داخل ہو گئے
اور وہاں ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ زینہ کے
اندر جمعیت بہت تھی، کچھ امدادی برقنداز پہونچ گئے۔ گرفتار کر کے غالب کو قید
کرا دیا گیا۔ بہت سے رئیس اور شرفا اس نازیبا حرکت سے برہم و ناراض ہوئے
عدالت میں برأت کے لئے مساعی ہوئے مقدمہ چلا اور قید ہو ہی گئی۔ عاصی
لکھتا ہے ؎

سر ابجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے (۱۲۶۳)۔ اور اٹھارہ سو سینتالیس
میں قید غریباں ہے۔

"تعلق غالب" نہ کیونکر موش اور گربہ کے دلبر ہو دلی بلی کتا تی کان چوہو نسے بہ دنداں ہے
(۱۲۶۳) رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیونکر ہو۔ "زن غمخوار" بن کر واں گیا فیض الحسن خاں ہے
سر بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے عاصی۔ اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بزنداں ہے

مکتوب غالب بنام صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں صاحب بہادر بیتاب[44]

قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے، اور جس کو کاٹ دیا
وہ معیوب ہے، اور جس پہ صاد نہیں وہ بے عیب اور ہموار، اور
جس کے معنی میں مجھے تامل ہے۔ اس پر نقطہ علامت اس کی نظم۔
باقی جا بجا منشا اصلاح اور حقیقت الفاظ لکھ دی ہے۔ تین جزو،

---

[44] مکاتیب غالب۔ امتیاز علی عرشی صفحہ ۲۵

جس میں سات ورق سادے ہیں۔ پہونچتے ہیں اور اچرا کھینچ دیکھئے غالب

میرے دل کی ذرا سی پھانس کیا ہو دیروادیکے

اوکھاڑا ایک ہی حملہ میں ہو در جس نے خیبر کا

حملہ میں در تھا

ہوا یوں دین اصحاب رسول اللہ سے شائع

ہوا دین نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شائع

کہ نکلے چوک میں سے جس طرح یا زار چوسر کا

اف رے گرمی تپ عشق کہ جل کر نکلا

رگ سے جب سوختہ جاں کے تیرے خنجر نکلا

دل سے

پھر مجھ کو کچھ خبر نہیں آگاہ اے خدا

پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب

تو ہاں

نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی ادن پہ

دیکھنے میں تو ہے اس طرح کی اچھی صورت

اس طور کی

شکر کی جائے، نہ اک خلق کو مارے ڈالو

خلق کے قتل سے کیا فائدہ۔ بس، شکر کرو۔

کیا قیامت ہوئی، اگر ہو گئی اچھی صورت

اللہ صبح یک خم گردوں ادلٹ گیا

باقی، رہی نہ بوند صبوحی کے واسطے۔

ساقی نے کس قدر مے گلگوں پلائی رات

بے خود اور وہ محوِ خیالِ رقیب تھے

تھی وصل میں بھی وہ ہی جدائی تمام رات

میں بے خود اور

قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لئے

قاتل نگار کھا ہے تیری تیغ کے لئے

تھی ورنہ عاشقوں کو نہ کچھ سر کی احتیاج

بیتابؔ کو اگرچہ نہیں سر کی احتیاج

کیا رحم کھا کے میری سفارش کچھ اوس نے کی

برہم جو ہے رقیب سے بھی یار کا مزاج

برہم ہے تجھ

درماں نے تیرے گور میں بھیجا دیا مجھے!

اب چارہ گر بتا میں کروں کیا ترا علاج

اب چارہ گر بتا کہ کروں

عادل ہے تو تو شک نہیں کچھ اسمیں اے خدا

ڈالی ہے کس مراد پہ تو نے بنائے چرخ

مراد پہ لیکن

آپ چل کر کہو احوالِ دل اوس سے بیتابؔ

اوس سے

کس کی دادات، قلم کیسی، کہاں کا کاغذ

کیا قلم، کیسی دوات، اور

دشمنوں کا اور فلک کا بھی میں اب مشکور ہوں

ممنون

خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم میرے آزار پہ

لکھ دیا لکھتے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آ گیا

رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر ہوہو

آپ سے پہلے میری کارِ نوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا ——— غالب

جلیع رسا نے اپنی دوبالا کیا اُسے
پیرہن

پہونچا تھا مرتبہ کو نہ اپنے سخن منوز

سخت جانی، تجھے اللہ کی مار، اے ظالم

پھر گیا، زندہ مجھے دیکھ کے دلبر مایوس
چھوڑ

خدا کرے ایترے پیکانِ تیر کو تو صنم
پیکانِ تیر کو ظالم

پسند آئے دلِ بے قرار کی آغوش

ہے میرے دوست کا بھی دشمنِ جاں وہ ظالم

میں نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص

یہ دونوں مصرعے غالب نے قلم زد کر دیے اور ان کے نیچے یہ تحریر کیا (عارف)

دوست یعنی معشوق. دشمن یعنی رقیب. رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے.
دشمنِ جاں نہیں ہوتا. مانا کہ وہ رقیب معشوق کا در پردہ دشمن ہے. پھر اس
عاشق نے اپنے معشوق کے عدو سے اخلاص کیوں نکالا؟ خدا جانے اس شعر
کے فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا ——— غالب

دوستی اپنی، خدا کے لئے کہہ کر کھیلے
تھے

نہیں بھاتا ہے مجھے، ناصحو، اتنا اخلاص

قاصد کی تاب کیا ہے، کبوتر کی کیا مجال؟
پہونچا دے یار تک تو ہی، بہ رہ رو دگار خط

یہ دونوں مصرعے بھی غالب نے قلمزد کر دیے اور ان کے نیچے تحریر کیا
"یہ گستاخی بے مزہ ہے ۱۲"

بے داد دل، وگرنہ یہ دونوں ہیں بد بلا
کرتے ہیں آہ و نالہ، ترا، اے خدا لحاظ ۲۰

اس شعر کے قطعہ میں غالب نے یہ عبارت لکھی "ہاں اس میں نکتہ ہے"

دیوانہ ہے وہ کون، جو دن کو جلائے شمع
خورشید رو کے سامنے کیا کوئی لائے شمع
اس مہر وش کے

پروا و پاس نہ کیجیے، مجھے شرم آتی ہے

نہ داد مجھ کو کہتے ہو، تم کو حیا نہیں
میں مبتلا ہوں آپ کا، وہ مبتلائے شمع

دیکھو یہ چھیڑ ہم سے کہ وہ غیروں کے سامنے
کر
انجان بن کے پوچھتے ہیں، ماجرائے داغ

درماں کرے گا دیکھو تو کس کا چارہ گر
ہیں زخم نہ آبلے بھی تو دل پر سوائے داغ
ہے زخم اور آبلہ

وہ بھی تو بھاگ نکلے یقیں ہے مجھے اگر
الٹے وہ بھاگ نکلے
دوڑے مرا گلا تری شمشیر کی طرف

اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہر تجھ یہ کیا قلق
تجھ کو کیا قلق
جب قابل بیان نہ اپنا رہا قلق۔

پھر میٹھے میٹھے چھیڑ لگائی خدا سے ڈر — ظالم ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

نکالی

لکھے نہ نامہ میں اب کیوں یہ شوق حسرت وصال۔ ہم اپنے سر کو تو ہر دم قلم سمجھتے ہیں

لکھے نہ نامہ میں کیوں شوق سجدۂ در دوست

ادھیں تو وصل کا ایک دم بھی ہے ہزار برس۔ ہزار سال کو ہم ایک دم سمجھتے ہیں

وصل کا ہے ایک دم

الماس تک نہیں تیرے مرہم میں چارہ گر — پھر کیوں ہیں زخم دل کو عبث بے مزا کرو

ہرگز نمک

ہوا شق جلوۂ جاناں سے وہ بھی — کیا گر ماہ نے ٹکڑے کتاں کو

وہ بھی انگشت نما سے

مسیحائی نہ دیکھی ہو تو میرے — جنازہ پر لے آؤ دلربا کو

گرا دس کی — مری تربت پہ لاؤ

بھا گیا اپنے زبس قتل کا ایسا ہم کو — بعد مردن بھی تھی مرنے کی تمنا ہم کو

عشق نے دم ہی پہ بیتاب بنادی آخر — کسی صورت سے بھی کافر نے نہ چھوڑا ہمکو

ننگ عریانی ہو کیوں قطع نظر سودے سے (وحشت) — جبکہ اللہ نے پیدا کیا ننگا مجھ کو

مقتضائے بشری صبر بھی تھا اے اللہ — یہ بھی دنیا تھا بنایا تھا جو انساں مجھکو

وہ دیکھا جس بت کو لگے پڑھنے اسی کا کلمہ — میرے خالق نے دیا ہے عجب ایماں مجکو

ہزار صبر کرو لاکھ بے قرار نہ ہو — مگر وہ چیز ہے الفت کہ آشکارا نہ ہو

نہیں وہ چیز محبت

بڑے بے ادب ہے جسے قیس نے کیا سجدہ   کسی سے پوچھو تو اپنا ہی وہ مزار نہ ہو
کہیں یہ حضرت جناب کا

بہا تے ہیں تو وہ دریا بہائیں چشم تر دونو   فغاں و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہیں بے اثر دونو
اس شعر کے نیچے غالب نے یہ عبارت لکھی اور آخر میں لا علامت بنائی ؎
"دونوں" میں نون ضرور چاہیے۔ اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھ دو۔ بعد
کیونکر منہ رکھے وہ میرے سینۂ پرداغ پر۔ بو۔ی۔ گل ہے خار نازک پہ جس کی بار ہو
حق تو یہ ہے خوب ہی دی غیر کو رونق مگر۔ بادفا کیوں کر بنا تے اس کو تم لاچار ہو
لاچار فقط مہمل ہے۔ ناچار پڑھو تو صحیح ہے وبلا

آواز اوس کا سن کے شب وصل مر گئے   گویا ہماری موت تھی مرغ سحر کے ہاتھ
خانۂ آئینہ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی   دیکھ رکھ دیتا ہے جب وہ مہ شمائل آئینہ
کر بھتا

مجموعہ کا سا عطر ہے اوس کا سینہ (   ) بو ہی بدن ملی ہے جو بو ہی بدن کیا تھا
تے گلے کا ہار

جاں کنی ہی ہووے اتبک آس تو ٹوٹی نہیں۔ حشر میں ہووے گی اس کو ایک صحبت اور بھی
ہو پر اتبک

گریہ زاری کو جو روکا تو سودا ہو گیا   ہو گئے ہم خبط کو نے سے نصیحت اور بھی

میں نے اس شعر کو ناحق کاٹا۔ "جو روکا" یہ لفظ مکروہ تھا۔ "جو" کی جگہ "جب"
لکھ دیجئے۔ شعر صاف اور بے عیب ہو جاوے گا ——— غالب
قتل میں اپنے اخدا اب کونسی تاخیر ہے   خم یہاں گردن، علم وہاں ہاتھ میں شمشیر ہے

ہے غزلی خواں شبلِ بلبل کہتے ہیں اُڑ وہ برگِ گل۔ یہ ہمارے سامنے تو غنچہ، تصویر ہے نظم

غالب کا ایک خط بنام سید محمد عباس علی خاں صاحب بہادر بیتاب اوپر دیا جا چکا اور اس کے ساتھ بیتاب کے اشعار پر اصلاح غالب نے جن مصرعوں یا اشعار کو قلمزد کر دیا ہے یا جو الفاظ مصرعوں اور اشعار میں کاٹ کر اس کی جگہ متبادل یا موزوں الفاظ کی نشست کر دی ہے وہ یہاں بجائے قلمزد کرنے کے ان کے نیچے ایک لکیر کھینچ کر عبارت الفاظ جس طرح اصلاحی نشست میں لکھے دے دیئے گئے ہیں۔ صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں نواب فردوس مکان کے حقیقی چچا زاد بھائی اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ امیر مینائی ان کے باب میں فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ صاحبزادے مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں بہت ممتاز ہم چشموں میں خوش فکری کی بدولت سرفراز ہیں۔ چھیاسٹھ برس کی عمر ہے" (انتخاب یادگار صفحہ ۲) اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۲۲۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں انھوں نے اپنا دیوان، جو مومن خاں مومن مرحوم کے اصلاحی کلام پر بھی مشتمل تھا، غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ اور اس کے بعد بھی بذریعہ مراسلت برابر اصلاح لیتے رہے۔

لہ و ۲ے اولذ کر سے مراد نواب سید یوسف علی خاں بہادر اور مؤخر الذکر سے منشا نواب سید کلب علی خاں بہادر، سابق والیان رامپور ہیں۔ (عارف)

دیوان مذکور کتاب خانہ ریاست رام پور کے ردی گھر میں پڑا تھا جسے ناظم اعلیٰ کتاب خانہ ریاست ہذا علامہ امتیاز علی خاں عرشی مدظلہ نے نکالا بیتاب کے دیوان کا پہلا ورق دست برد میں ضائع ہو چکا ہے۔

لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید تحریر کرتے ہیں کہ ۱۸۲۷ء میں کئی برس سے دلی میں رہتے تھے۔ نہایت پاکیزہ سرشت اور خوش مقال کمالات ظاہری و باطنی سے مزین تھے۔ عاشقانہ اور معاملے کے اشعار خوب کہتے تھے۔ بیتاب ۲۹ رجب المرجب ۱۳۰۱ھ مطابق ۶ جون ۱۸۸۴ء دوپہر کے وقت فوت ہوئے ان کا دیوان "گلدستۂ باغ جناں" کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ کتب خانہ رام پور میں مطبوعہ نسخہ کے علاوہ تین قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں[1]

اب ایک مزید خط از طرف غالب بنام صاحبزادہ ممدوح مرقومہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۶ء درج کیا جاتا ہے یہ ہر دو خطوط اپنی جہت کے آپ ہیں اور اس بنا پر بے حد اہم اور مفید ہیں کہ ان کے ہمراہ غالب کے اصولِ اصلاح اور اصلاحوں کا معتد بہ حصہ اہل ادب کے مطالعہ میں آئے۔

> "قبلا! قصاید و غزلیات و رباعیات کو بہ قدر اپنی فہم و فراست کے درست کر کے خدمت میں گزارتا ہوں۔ چونکہ جانتا ہوں کہ آپ اکبر آباد نہیں گئے۔ اس لفافہ کو آپ کے پاس رام پور کے

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۱۱۲

تجھے سے سمجھتا ہوں۔ توقع یہ کہ مجھکو اپنا خادم سمجھئے اور جو خدمت
میرے لائق ہو بے تکلف ارشاد کیجئے۔ راقم اسد اللہ خاں۔

اک ذرا سکا اور بھی تاخیر کرنا اے اجل — سنتے ہیں کچھ وہ ابھی اپنے قتل کی تدبیر ہے

بہانے

جو قتل کرتے ہیں گمانِ دادخواہی پہ ہمیں — دیکھو تو تقصیر سے پہلے یہاں تعذیر ہے

ہمنشیں

گذری اپنی عمر تو کس چین سے اے بگر خدا — دیکھئے جیتا اب کیا خواہشِ تقدیر ہے

ابتک عمر اپنا

فرماتے ہیں پالیں پہ وہ بیمار کے اپنے — کیا درد ہے ہو کیوں اسکا مداوا نہیں کرتے
ہیں کرنا تھا جو وہ کر بیٹھے آکر — اور تم سر اٹھاؤ نہ گر بیٹھے

آپ ہمیں بتائیں

اپنے ہاتھوں سے کر کے کام تمام — نوحے کرنے کو چار ناگر بیٹھے

تو تجھ

وفادار ناصح مبارک ہوں تم کو — ہمیں تو وہی بے وفا چاہئے

تمھیں

مقابل میں تیرے تو اے پند فرما — تجھی سا کوئی بے وفا چاہئے

پند گو

خدا نے دیا ہے عجب دل یہ ہم کو — اب ایسا ہی ایک دلربا چاہئے

ہمیں

بجا ہیں تمھارے سب ارشاد لیکن — ذرا اوروں کی بھی سنا چاہئے

زباں پہ نام اوس کا دم بدم ناصح لیا آتا ہے۔ خدا کے واسطے چپ رہ کلیجہ منھ کو آتا ہے

تیرے

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ — کچھ تو عقبیٰ میں تو، ناصح، رہے کام آنے سے
آپ عقبیٰ

کروں کیا جان سے تنگ آ کر دعا کی — بتو منت ہی کروائی خدا کی
کریں کیا مرگ کی آخر

ڈرانا تھا کہ اس کا دل دکھانا! — خدنگِ آہ نے، ہے ہے! خطا کی
گئے وہ تو ہوا ہم کو بتا کے — خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی
بتا کر

۲ عیادت سے بڑھی خواہش مرض کی — ہمارے درد کی اچھی دوا کی۔
عیادت سے مرض کا ہو اگیا ذوق
نہ ہنسیئے قیس کی دیوانگی پر۔ — خبر تو لیجئے اپنے مبتلا کی۔

نہ دو لیلیٰ کو تم مجنوں کا طعنہ — جو دیکھو صورت اپنے مبتلا کی۔
زلف بکھری جو رخ یار پہ یاں دل بکھرا — خود پریشاں ہوئے ہم اسکو پریشاں کر کے

یہ دونوں مصرعے غالب نے کاٹ دیئے ہیں۔ اور یہ عبارت لکھ دی ہے
" زلف خود بخود بکھرتی ہے — ہم نے کب پریشان کیا جواب کہیں تلک
آہ! جس طرح موئے سب عاشق — وہی دینی کبھی حقیقت ہو گی۔
جس طرح آہ

اس کے نیچے غالب نے لکھا " طرح ' اور ہے۔' فقیر " طرح " بہ حرکت کے
معنی میں طرح بہ سکون نہیں لکھتا ہے

دیکھو ایمان سے کہہ دے واعظ — ایسی ہی حور دل کی صورت ہو گی
جب

اس غزل میں مقطع سے پہلے یہ شعر اضافہ کیا ہے ۔

بوسہ لیتے ہی ابھر آ جائے گی   جان کیا بوسہ کی قیمت ہوگی

بے قراری سے مرا جی ہے ۔ کوئی اللہ سے ۔ مانگ لائے ایک ذرا صبر اپنے نام سے

اوپر کے شعر کا مصرعہ اولیٰ غالب نے بالکل کاٹ دیا اور مصرعہ ثانی میں
'لائے' اور 'اپنے' کاٹ دیا ان کی جگہ متبادل اصلاحی الفاظ کوئی نہیں رکھے بلکہ
مندرجہ ذیل پورا شعر کہہ دیا ہے

حضرت ایوب گر جیتے ہوں تو لے ہمدمو   مانگ لاؤ اک ذرا سا صبر میرے نام سے

حشر میں اللہ کے آگے یوں ہی لیجاؤں گا   کام لینا ہے مجھے اپنے دلِ ناکام سے

اس شعر پر غالب نے کوئی اصلاح نہیں دی ۔ ذیل میں فقط اتنا لکھ دیا "مجھ
سے یہ مصرعہ پڑھا نہیں گیا فقط"

تو دیے جا گالیاں ، دے لینگے ہم بھی کچھ جواب
ہوش میں آئے کبھی تو لذتِ دشنام سے

تھا ذرا بس شوقِ طپیدن پر ادب مانع ہوا ۔ بچ گئے آجاتا ہے ورنہ کبھی کے بھی دقت اس الزام سے

دیر دیکھا ، میکدہ دیکھا ، حرم بھی دیکھ لیں ۔ آج آنکھیں ہیں یہاں بھی گردشِ ایام سے

ذکر اسی کا ہے ، کچھ فرمائیے   کاش ! ناصح ہی دل کو بہلائے

پھر بلا میں پھنسا دیا کس نے   دی صدا نقش پر کہ وہ آئے
خواب خرگوش سے جگا

جواب ان کا ہوا گلہ اوٹا   کر کے شکوہ بھی اون سے پچھتائے
اور
پچتائے

مارے خدا کہ چھوڑ دے۔ پر ایمان کی تو یہ ہے۔ الفت بتوں سے اپنے تئیں لا کلام ہے

(اس بیت کو قلم زد کر کے لکھا ہے) "کو" کی جگہ "تئیں" نہ لکھا کرو۔ بصر۔

جبروت یہ نہیں ہے، نہ لاہوت زاہدا ۔۔۔ یہ عشق ہے۔ کچھ اور ہی اس کا مقام ہے

اس شعر کے نیچے یہ عبارت درج کی: "لاہوت ہے نہ یہ جبروت۔ اے خدا پرست۔ جَبرُوت بہ حرکت موحدہ اور مَلکُوت بحرکت لام صحیح ہے۔"۱۲

پاکر نجات نزع سے آرام کرتے ہیں ۔۔۔ ہم رہروِ فنا ہیں، یہ غربت کی شام ہے

سوتے ہیں بیخبر

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ ۔۔۔ ساقی اگر نہیں تو نہ ہو، مے سے کام ہے

جیتا ہے پی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ ۔۔۔ یہ خم ہے، یہ سبو ہے۔ یہ شیشہ، یہ جام ہے

ان دونوں اشعار کے ہر چہار مصرعوں پر صاد بنا کے دائیں گوشے میں لکھتے ہیں "واللہ! کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب"۱۲ (پھر بائیں گوشہ میں لکھتے ہیں: "خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں"، اس تقدیم و تاخیر کا مزا میں ہی جانتا ہوں" غالب

ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کریں گے ۔۔۔ آزار تو دینے کو کبھی یاد کریں گے

ہر روز کئی بار مجھے یاد کریں گے

پرواز کی ہے گرچہ ہوس دل میں مگر ہم ۔۔۔ آزردہ نہ خاطر تری صیاد کریں گے

طاقت ابھی موجود ہے لیکن ۔۔۔ نہ ہم خاطر

اس طرح مریں گے کہ ہو ہر ایک کو عبرت ۔۔۔ معدوم ہم الفت ہی کی بنیاد کریں گے

اس ڈھب سے

خدا کے آگے ہمیں پوچھے جائیں گے پہلے میری دفورِ ضلالت ہی رہنما ہوگی

یہ شعر قلم زد کر دیا گیا ہے اس کے بعد لکھا ہے "پوچھنا اردو ہے۔ پرسیدن کا ترجمہ پوچھنا بے نون کے ہے۔ یہ آگہی کے واسطے لکھا ہے۔ شعر غلطی املا کے واسطے نہیں کاٹا۔ بلکہ ناقص تھا دیکھ

فلک بہائے گا آنکھوں کی راہ اس کو بھی جو خونِ دل ترے غم میں میری غذا ہوگی

اس کے ذیل میں غالب نے لکھا ہے "خون مذکر۔ غذا البتہ مونث ہے مگر ذرا غور کیجئے، خون غذا ہوگا، یا خون غذا ہوگی" یہ لکھ کر شعر کاٹ دیا۔

نہیں ٹھہرا ہے اب تک عرشِ اعظم دعا کی تھی یہ کس نے بلبلا کے

مومن اس کے خونِ جگر ہم پئیں، یہ مے ساقی۔ خدا کرے دترے ساغر میں کبھی لہو ہو جائے

ع۔ خدا کرے کہ ترے جام میں لہو ہو جائے۔ اس شعر پہ صاد بنا کر حاشیہ پر لکھا کر "شعر اچھا ہے مگر کبھی کا لفظ بے موقع اور بے محل ہے" مصرعہ ثانی میں "ساغر" اور "کبھی" قلم زد کر دیا ہے۔ ان الفاظ کی جگہ متبادل لفظیں نہیں رکھیں بلکہ پورا مصرعہ بدل کر لکھ دیا۔ جو شعر کے نیچے درج کر دیا گیا ہے۔

ہوئے ہیں گرچہ تائب پر ہوا و ابرو باراں ہیں۔

رہے مے ساقیا، میخانہ میں تیار تھوڑی سی

میں سب سمجھے ہوئے ہوں بات کا جو ڈھب تمہارا ہے

نہ جائیو ناصحا میں اس کو یہ مطلب تمہارا ہے

کہاں ہیں قیس اور فرہاد اب یہ عہد ہے اپنا

کہاں ہے لیلی و شیریں، زمانہ اب تمہارا ہے

مژگاں سے تیری نسبت یہ کس طرح سے جو دل

یہ جو کس طرح سے دل

اس تیر کے لئے بھی تو تخمینہ چاہئے

~~نیکوں کے بھی جھکے رہیں سر گو تو دیر کی۔ مسجد کی چوب و خشت سے تیور چاہیئے~~

اس شعر پر کچھ اصلاح نہیں دی بلکہ فقط اتنا لکھ کر رہنے دیا "یہ مصرعہ مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ معلوم نہیں یہ جملہ مصرعہ اولیٰ کیلئے تھا یا مصرعہ ثانی کیلئے کوئی مطلب واضح نہیں ہو سکا۔"

بلا ہیں آپ پڑتا ہے تو ناصح	ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے
خدا کیونکر ملائے دل ربا سے	نہ کہنے دو کہ یہ قدرت نہیں ہے
بھلا کہہ کے تا لو حق شناسو	کرے جو چاہے یہ عادت نہیں ہے
ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو	تمھارے آگے کو غیرت نہیں ہو
آج پیغام بر نہ کچھ کہنا	ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے

(اصلاح: تو پڑتا ہے — معاذ اللہ — بہلاتا ہوں دل کو — عزت — وہ ہم پہ بہت)

مصرعہ ثانی پر اصلاح دے دی ساتھ ہی نیچے یہ عبارت قلم بند فرمائی کہ "ہیں وہ ہم پہ بہت، جہاں پورا لفظ آسکے یعنی "پر" وہاں ادھورا لفظ "پہ" کیوں لکھیے۔ البتہ جہاں گنجائش نہ ہو وہاں قاعدے کے موافق جائز ہے، اور

اس قاعدہ کا نام تخفیف ہے "ﷲ

یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاب — تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

(آپ بھی)

تیغ کھینچے ہوئے جسوقت وہ قاتل آئے — کوئی ہے میرے سوا جو کہ مقابل آئے

(کون)

کیوں یک بیک زمانے کا نقشہ بدل گیا — یہ رنگ تو ہوا نہ تھا دنیا میں آشکار

(ناگاہ کیوں)

عزت میں کچھ آج کل ہے وہ اس خاکدان کی — خلد بریں بھی روبرو ہے جس کے شرمسار

اس شعر کا مصرعہ اولیٰ قلم زد کر دیا اور مصرعہ ثانی میں "ہے" کاٹ دیا مگر کچھ اصلاح نہیں دی فقط اتنا لکھ کر اکتفا کی کہ "یہ مصرعہ مجھ سے پڑھا نہیں گیا" مصرعہ ثانی کے نیچے لکھا "روبرو جس کے ہے" مگر بعد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی قلم زد کر دیا گیا۔

گل نے کیا ہے شاخ کے ہر جزو سے سر بدہ — اب کون سی جگہ ہے کہ نکلے جہاں سے خار

(ظہور)

بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزم نشاط میں — ہاں ایک صبا تو پھرتی ہے گلشن میں بیقرار

(اک نسیم)

کثرت سے لیکر جمع ہوئے ہیں شاہدان گل — کس کس مزے سے ہولئے آپس میں ہمکنار

(ہوتے ہیں)

دن عید ہے زمانے میں اور رات شب برات — ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار

وہ دل ہے آج جس پہ کروں جان تک نثار ہے جشنِ غسلِ صحتِ نواب نامدار
جان تک فدا

"جان تک فدا" اگر یہ مطلع ہے تو چاہئے اس سے قبل ایک شعر میں اطلاع دی جائے۔" شعر پر مصرعہ اولیٰ میں غالب نے اصلاح دے کر نیچے یہ عبارت قلم بند کر دی۔

ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی صفت بیتاب اب دعا ہی پہ ہے بہ اختصار
ثنا

بات یہ ہے وقت پہ خوب سمجھا ہی مجھے فکرِ رسا کا بڑا مجھ پہ یہ احساں ہوا
نطق

دھوم سے سرکار میں جشن کا ساماں ہوا عرش سے لے فرش تک عیش کا طغیاں ہوا
دھوم ہے سرکار میں جشن کا ساماں ہے آج

رنگ محل کا سماں ، ہو نہیں سکتا بیاں جس کی نظر پڑ گئی ششدر و حیراں ہوا
دا لہ

کثرتِ مقیشِ سے مثلِ جبینِ عروس روی زمیں پر عجب طرح کا افشاں ہوا
طرز

بزم منور ہوئی مقدم نواب سے جبکہ وہ رونق فزا جوں مہ کنعاں ہوا
ع جب سے کہ رونق فزا وہ مہ کنعاں ہوا۔ الخ۔ جوں بمعنی مثل و مانند۔ اب متروک ہے۔ مرزا غالب نے اس شعر کے ذیل میں یہ عبارت تحریر فرمائی۔

دور میں اوس کے بجز ابر نہ رویا کوئی اور جرس کے سوا کوئی نہ نالاں ہوا

مسندِ اقبال پہ یوں وہ متمکن ہوا | صفحۂ گردوں پہ جوں مہرِ درخشاں ہوا

"(مرزا صاحب نے اسے قلمزد کر کے یہ مطلع لکھا تھا)" یہ عبارت اس شعر کے نیچے بقیہ درج ہے۔ اس کے بعد ذیل کا مطلع ہے۔

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ قاآں ہوا | ویسا ہی اس قوم میں کلبِ علی خاں ہوا

اس پر جناب نے لکھ دیا ہے "قصیدہ بنام در شانِ یوسف علی خاں بہادر مرحوم بود۔ از ایں سبب شعرِ ہذا نوشتنی نیست"

ہو رہی ہے عجب آرائشِ کہنہ سرا (دنیا کی) | سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوئے ہیں مامور

ترکھڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبریل | اک طرف ہاتھ میں لے رکھتے ہیں سرافیل بھی صور

قبضِ ارواح سے معذور ہوئے عزرائیل | موت کا غم ہی کسی کو نہیں سب ہیں مسرور (کی فکر)

زیب و زینت کا اب اس دہر میں کیا کہنا ہو (کی) | صانعِ گل کی جو تعلیم ملا اک کا شعور

چاندنی رات کا تو ذکر ہی کیا اصل علیٰ (کیا ذکر ہو الله الله) | لیلۃ القدر پہ فائق ہے شبِ تار کا نور

کو بکو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اک دیں کس کو زکات | تھے جو محتاج جہاں میں وہی ہیں ذی مقدور (وہ ایسے ہوئے)

کوئی دعوت سے مسافر بھی نہ محروم رہا | بادشاہوں کے یہاں کبھی تو نہ تھا یہ دستور (بادشاہانِ جہاں کا بھی نہ تھا یہ دستور)

اس قدر کھانے کی افراط ہوا اور پانی کا قحط | دیکھو جس چاہ کو شربت سے ہے منہ تک معمور (ہے کنوے)

کس سلیقے سے ہے آرائشگی ہر ہر شے کی   ہتمم بزم کے آج اپنا دکھاتے ہیں شعور

ہر

تھا پہ طبلوں پہ پڑی آئے پریوں کے جھمگھٹ۔ شادیانے کی صدا پہونچی فلک کو بھی دوڑ

پریوں کے آئے جھمگھٹ

چلی اس طرح سواری کہ نہ دیکھی نہ سنی   رشک کھانے لگے مرقد میں امیر طیمور

شعر قلمزد کر دیا گیا۔ پھر یہ عبارت لکھی گئی "یہ لفظ "طوسی" سے نہیں "تے"
سے ہے۔ اور پھر تیمور بوزن طنبور نہیں، دراصل تمُر بوزن سرُدد ہے۔ لکھتے ہیں
بمور اور پڑھتے ہیں تمر، اور تمر ترکی میں فولاد کو کہتے ہیں" مصر۔

نگیں تاش تماشی کی ہیں باندھے سقے   ہیں ہزارے چڑھے اور عطر سے مشکیں معمور

تنکیاں

کرد ایں فخر قصائد چہ رقم خامۂ من   وجد کردند چہ خاقانی و عرفی در گور

مرزا غالب نے اس شعر کے نیچے یہ عبارت قلم بند فرمائی ہے: "خاتمۂ قصیدۂ ہندی
بر فارسی، خصوصاً وقتے کہ لفظ گور قافیہ باشد، مناسب نیست" غالب

۹ الحمد کہ اب چرخ ہوا نیک خصال   ترک اس نے کئے وہ اپنے قدیمی افعال

۱۰ میں ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے لعل و گہر   خزف و سنگ سے اپنے قدر ہیں دینار و ریال

۱۱ خزف بہ معنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اس کی رو سے ہے۔ غالب

ہی جا بہ جا بھگت، ریس کہیں، سانگ کہیں، کہیں کنچن، کہیں کتھک ہیں۔ کہیں ہیں قوال

عزت بھی تو ایسا کبھی تو ہی ہے ورنہ   اگلی عادت سے تو یہ بات تھی از بس ہی محال

بے اسرار سے واقف ہے، تو کوئی لے پرفن   بھید ترے کوئی پہچانے یہ ہے کس کی مجال

جن پہ بڑے صانع قدرت سے بھی دو ایک نقشہ کھینچا ادھی کچھ سکتیں گر ایسی اشکال
دو ہی نقشے کھینچ

اور شجاعت کا یہ عالم ہے کہ نہ ہو مرآب۔ دیکھ لیں حضرت رستم اگر اس کی تمثال
دیکھ لے رستم دستاں

ہو یہ حیرت، میں یہیں تھا کہ زمیں پر اللہ عرش کی سیر کا اک کو گر آجائے خیال
کہ میں یہاں تھا کہ زمیں پر یارب

وعدہ کے ساتھ وفا ایک جزء لاینفک ہے عہد کا نقض ہوا عہد میں اس کے ہے محال

"جزء لاینفک غلط۔ جزو لاینفک صحیح" شعر قلم زد کر دیا اس کے نیچے یہ عبارت
لکھ دی "بھوکے پیاسوں کے خورد و نوش کے کچھ آتے نزدیک۔ یہ مسلم ہو کہ بعد رمضاں ہے شوال
بعد از رمضاں

فلک پر کوئی اڑ جائے کہ یہ وہ ہی نصیبوں میں سواد دو گز زمیں ہے
یہ سچ، تحسین کے قابل ہیں معشوق مگر عشاق پر بھی آفریں ہے
آخر
جناب غالب دوراں کا بتیاب خلوص طبع کچھے اب خوشہ چیں ہے
کلام حضرت غالب ۔ "غالب دوراں" لفظاً نامانوس ہے۔ ملسر۔

ایدل، تو اس کو دیکھ کے ایسا پھسل گیا۔ حیراں ہوں میں کہ پہلو سے کیونکر نکل گیا۔
دل پر بنی ہوئی تھی اجل کے نہ آنے سے اب جاں پہ آبنی، تو ذرا دل سنبھل گیا
تو سینہ
یکساں مزا دکھاتے ہیں ہم بھی تو ٹھہر جا تقریریں کر کے رو دیا، ناصح تو بل گیا
جو
ٹھہر تو جا

دیکھا ہے وہ تیزاب کا کیوں ہوتے ہو برہم۔ ہم نے دل پر داغ پہ رکھا ہے جو مرہم

رکھا نہیں

کہوں کیا؟ یوں بنانے کی نہیں ہے — رقیبوں کے ستانے کی نہیں ہے

وہ بات ایسی چھپانے — پہ غیروں

تمھیں سچ باور آنے کی نہیں ہے — پر الفت کبھی دکھانے کی نہیں ہے

نہ کہ مجھ سے کرلے میری بلائیں — مری الفت

وہاں رقیبوں سے گرم صحبت، یہاں امید وفای وعدہ

ہے ایک طرفہ ہی یہ تماشا، تم اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش

یہ طرفہ تر

محبت تری، نفرت اوس کی بڑھی — یہ کیسا بڑا اب دلِ زار تیرے!

اے

مسرور ہوں اغیار خدا کی قدرت — اون سے ہو ترا پیار، خدا کی قدرت

اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ظالم — ہم شکل گنہ گار، خدا کی قدرت

چپکے — مثل

اخلاق حسین عارف کی دوسری تصانیف

یکجہتی اور غالب .. .. ۔ (زیر تالیف)

ایک گلاب دو بھونرے .. .. .. ۔ (ناول)

نقش ہائے رنگ رنگ ۔ ۔ ۔ (مضامین)

شعرا اور فن شعر

تنقید و تقریظ .. .. .. ۔ (ادبی مضامین)

مختصر تاریخ اودھ

شرحِ دیوانِ غالب .. ۔ ۔ ۔ (بہ ترتیب نو)

گرِ لالہ .. .. ۔ (مختصر افسانے)